معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسی روپیے فی شمارہ سات روپیے

پاکستان میں سالانہ دو سو روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک بیس پونڈ یا بتیس ڈالر

بحری ڈاک سات پونڈ یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحیٰی شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARULMUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کی ۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ اگر کسی مہینے کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع ۱۶ اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
کمیشن ۲۵% ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۶۰ ماہ ربیع الآخر ۱۴۱۸ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۹۷ء عدد ۲

فہرست مضامین

شذرات

اس وقت تمام ابلیسی قوتیں اور اسلام دشمن طاقتیں اپنی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے مسلمانوں کو باہم متحارب اور ایک دوسرے کے خلاف صف آرا رکھنا چاہتی ہیں تاکہ مسلمانوں کے استیصال اور بیخ کنی کا جو منصوبہ ان کے پیش نظر ہے، اس کے لیے انہیں زیادہ پاپڑ نہ بیلنا پڑے بلکہ مسلمان خود ہی آپس میں لڑ بھڑ کر اپنے آپ کو تباہ و برباد کرلیں اور وہ اس کا تماشا دیکھیں، رائی کو پربت بنانے، اسلامی ملکوں کی معمولی کمزوریوں کو طوفان بلاخیز میں تبدیل کر دینے اور اپنے اثر و نفوذ سے ان میں ہلچل اور ہیجان برپا کر دینے میں انہیں خاص مہارت ہے۔ افغانستان کی خانہ جنگی، پاکستان کا شیعہ سُنی جھگڑا اور مہاجرین کا فتنہ سب ان کے اسی کرتب کا نمونہ ہے، لکھنؤ کا شیعہ سُنی جھگڑا بھی اسی کی ایک کڑی ہے اسی لیے گزشتہ مہینہ ان صفحات میں گرفتارانِ بوبکرؓ و علیؓ سے ہم نے عرض کیا تھا کہ وہ سازشوں کا شکار ہو کر اپنی قوت و وحدت کو پارہ پارہ نہ کریں اور خود اپنے ہی ہاتھوں اپنی تباہی کا سامان نہ کریں۔ گو اکثر لوگوں کو ہمارے معروضات پسند آئے اور بعض اخباروں نے ان کو اپنے کالموں میں نقل کیا مگر ہمارے دو کرم فرماؤں کے لیے ہمارا نالۂ پُردرد باعثِ کرب بن گیا۔

ہمارے بڑے مخلص کرم فرما اور دارالمصنفین کے خاص عاشق و فدائی ایک شیعہ بزرگ کے خیال میں اخلاص اور نیک نیتی کے باوجود ہماری تحریر شیعہ سماج سے بیگانگی اور کم واقفیت کا پتہ دیتی ہے، لیکن انہوں نے جو باتیں تحریر فرمائی ہیں ان کے متعلق عرض ہے کہ مجھے شیعہ سُنی میں باہم رشتہ و مناکحت کا علم ہے، میرے وطن کے قریب ایک موضع میں ایک ہی خاندان کے کچھ افراد شیعہ اور بعض سُنی ہیں اس سے اور دوسرے شیعہ خاندانوں سے ہمارے خاندانی روابط بھی تھے، مجھے اس کی بھی خبر ہے کہ میر صاحبان کے سارے خدمتگار سُنی ہوتے تھے لیکن یہ بالکل ناخواندہ اور بہت پست اور ادنیٰ طبقوں سے تعلق رکھتے تھے، اسی خدمت پر ان کی گزر اوقات منحصر تھی۔ یہ بس نام کے

سُنی ہوتے تھے ان کا نہ کوئی خاص دین و عقیدہ تھا اور نہ ان میں ایسی ایمانی حمیت ہی تھی کہ تبرے یا محرم کی ان رسوم کی وجہ سے جو سُنی نقطۂ نظر سے صحیح نہیں ہیں اپنی اپنی خدمت سے دستکش ہو جاتے۔ اس لیے ان کی موجودگی تبرے کے لیے رکاوٹ نہیں بن سکتی تھی۔

البتہ ہم کو یہ معلوم نہیں کہ شیعوں کی اذان یا ان کی مجالس اور ذکرِ حسین کی محافل پر بھی سُنی معترض ہوتے ہیں، ہمارے خیال میں سڑکوں اور شاہراہوں پر نکلنے والے جلوس ہائے عزا میں ہونے والی تبرے بازی سے سنیوں کو اصل شکایت ہے لیکن فاضل مکتوب نگار نے اس کی نفی فرماتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "جن ذاکروں کے یہاں کبھی بے اعتدالی کا مظاہرہ ہوتا ہے اور کبھی کبھی معقولات سے زیادہ مطاعن راہ پا جاتے ہیں" تو اس کا باعث بعض وہ سُنی حضرات ہیں جو برسرِ منبر "فلاں ابن فلاں رافضی بود - بر پدرش لعنت" کہتے ہیں۔ دراصل ہماری تحریر کا منشا دونوں فرقوں کے اسی طرح کے لوگوں کو متنبہ کرنا تھا کہ وہ امت کے وسیع تر مفاد میں اب اس طرح کی باتیں کہنے سے باز آجائیں۔ لیکن ہمارے نزدیک مکتوب نگار کی یہ شکایت بیجا ہے کہ تقویۃ الایمان جیسی کتابوں کے قدرداں ان کی مجالس سے کنارہ کرنے لگے۔ تقویۃ الایمان اہل تشیع کے نزدیک خواہ کتنی ہی قابلِ اعتراض کیوں نہ ہو لیکن یہ تو ضروری نہیں کہ سُنی بھی اسے قابلِ اعتراض سمجھیں، آخر وہ انکی مجالس سے کیوں نہ کنارہ کریں جب کہ ان کے عقیدے کے مطابق یہ درست ہی نہیں ہیں، شکایت اس وقت بجا ہوتی جب سُنی ان مجالس اور ان کے اندر ہونے والی باتوں کے خلاف علی الاعلان لب کشائی کرتے۔

ہمارے انھی کرم فرما بزرگ کی مہربانی سے ہم کو نئی دہلی سے شائع ہونے والے "سیکولر قیادت" اخبار میں ڈاکٹر مولانا کلب صادق کا یہ فراخدلانہ اور صلح پسندانہ بیان پڑھنے کو ملا کہ "لکھنؤ کے بعض اہلسنت حضرات کا خیال ہے کہ شیعہ حضرات جلوس ہائے عزا میں تبرا پڑھتے ہیں جب کہ واقعیت اس کے خلاف ہے، تاہم اس بحث میں میں نہیں پڑتا، میں تمام علمائے شیعہ لکھنؤ کی

طرف سے برادرانِ اہلسنت کو یقین دلاتا ہوں کہ جلوس ہائے عزا میں تبرا ہرگز نہیں پڑھا جائے گا۔ ہم سب ہر اس بات پر عمل کے لیے تیار ہیں جس سے برادرانِ اہلسنت کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ ان جلوس ہائے عزا میں صرف و صرف ماتم حسین و شہدائے کربلا ہی کیا جائے گا۔ امید ہے کہ اس تحریر کے بعد غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی، ویسے ہمارے تمام مجتہدین نے جن کی شیعہ فرقہ تقلید کرتا ہے متفقہ طور پر یہ فتویٰ دیا ہے کہ شیعوں کو ہرگز کسی ایسی بات کو انجام دینے کی اجازت نہیں ہے جس سے صفوفِ مسلمین میں انتشار پیدا ہو اور وحدتِ مسلمین متاثر ہو، میں یہ فتویٰ جلیل القدر علمائے اہلسنت کو دکھا چکا ہوں"۔

اس قول فیصل اور صریح ذمہ دارانہ بیان کے بعد سُنی حضرات کو جلوس ہائے عزا پر معترض نہیں ہونا چاہیے اور اگر حکومت اس پر عائد پابندی ختم کر دے تو نہ اس کی شکایت ہونی چاہیے اور نہ مدح صحابہ کے لیے انہیں اصرار کرنا چاہیے کیونکہ [illegible] کے نقطۂ نظر سے دونوں جلوسوں کی کوئی دینی حیثیت نہیں ہے۔ مولانا کلب صادق پر سُنی حضرات بھی متفق ہیں وہ مسلم پرسنل لا بورڈ کے نائب صدر اور کئی ملی تنظیموں سے وابستہ ہیں۔ اتر پردیش کی حکومت نے ان سے ملنے سے انکار کر کے اور مولانا کلب جواد کو گرفتار کر کے جو نارو اقدام کیا تھا ہم اس کی پُر زور مذمت کرتے ہیں۔

ہمارے جن عزیز سُنی دوست نے ہماری دعوتِ اتحاد کا بُرا مانا ہے اور اسے ہماری انتہائی سادہ لوحی قرار دیا ہے، اب وہ لکھنؤ میں نہیں رہتے لیکن انکا وطن یہیں ہے اسی لیے اس معاملہ میں انکی شدت و غلظت زائل نہیں ہوئی ہے ہمیں انکے ذاتی خیالات سے بحث نہیں لیکن ہم نے یہ کہاں کہا تھا کہ شیعہ سُنی جھگڑے کو دفن کرنے کے لیے دونوں اپنے دین و عقیدہ ہی کو خیرباد کہدیں، ہماری گزارش تو صرف اس قدر ہے کہ دونوں اپنے اپنے اعتقادات پر قائم رہتے ہوئے تصادم اور ٹکراؤ سے بچیں اور اپنی تفضیح اور رسوائی کا سامان نہ کریں، اگر انکے نزدیک دونوں میں اتحاد صرف سماجی بنیاد پر ہو سکتا ہے تو اسکی کیا صورت ہوگی آپ شیعوں کو جو بھی سمجھیں لیکن یہ یاد رکھیں کہ اسلام نے غیر مسلموں سے بھی میل ملاپ کی تعلیم دی ہے لکھنؤ میں امن و امان قائم کرنا شیعہ و سُنی کا فرض ہے جس کے لیے دونوں کا اتحاد ضروری ہے خواہ وہ کسی بنیاد پر ہو، اسکے لیے فصل کے بجائے وصل کا رویہ اپنانا ہوگا۔

مقالات

تمدن ہائے قدیم میں جرم و سزا

از
جناب نور احمد شاہتاز صاحب۔ کراچی

جرم و سزا کا سلسلہ کبھی بھی تمدن میں اہم حیثیت رکھتا ہے بلکہ کوئی بھی قوم نظام جرم و سزا کو قائم کیے بغیر متمدن نہیں بن سکتی کیونکہ یہ تو ناممکنات میں سے ہے کہ کسی معاشرہ میں مجرموں کو کھلی چھٹی دے دی جائے اور ان کی من مانی کارروائیوں سے معاشرہ میں کوئی بگاڑ پیدا نہ ہو۔ متمدن قوم یا معاشرہ وہی ہے جس میں بگاڑ کم سے کم ہو اور جرائم کو کنٹرول کرنے یا کم سے کم سطح پر لانے کے لیے لازمی طور پر نظام جرم و سزا قائم ہو۔[1]

زیرِ نظر مضمون میں اس بات کا جائزہ لیا جائے گا کہ معروف تمدنوں میں نظام جرم و سزا کی کیا کیفیت تھی۔ اس نظام میں قابل سزا (قابل حد) جرائم کیا کیا تھے اور ان کی سزا کی نوعیت کیا تھی؟

ماہرین عمرانیات کا خیال ہے کہ اب تک دریافت ہونے والے آثار قدیمہ سے جس قدیم ترین تمدن کے نظام قضا کا علم ہو سکا ہے وہ بابلی Sumarians تمدن ہے۔ تاریخ تمدن کے ایک نامور تاریخ نگار ول ڈیورنٹ کہتے ہیں:

" Written History is atleast six thousand years old . During half of this period the centre of Human

Allairs so far as they are now known to us was in the near east. . . . " (2)

یعنی تحریر شدہ تاریخی سرمایہ زیادہ سے زیادہ چھ ہزار سال قدیم ہے، اس پورے عرصہ کا کم ازکم نصف حصہ ایسا ہے جس کے بارے میں حالیہ معلومات کے مطابق انسانی امور کا مرکز مشرق قریب رہا ہے۔

انسائیکلو پیڈیا آف امریکانا میں Civilization کے حوالہ سے ولیم ایچ مکنیل (William H. Mcneill) لکھتے ہیں :

"تقریباً تمام محققین اس بات پر متفق ہیں کہ قدیم ترین تہذیب جس کے بارے میں ہمیں علم ہوسکا ہے وہ میسوپوٹیما میں سمیریوں کی ہے۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء میں دریافت ہونے والے آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ عرفات کے دہانے پر درجنوں دیہات اور شہر آباد تھے جن کا تعلق ۳۵۰۰.... ق م قبل مسیح سے ہے۔"[3]

بابلی یا سومری تمدن کے بعد دوسرے نمبر پر مصری اور پھر ہندی تمدن کو قدیم مانا گیا ہے، انسائیکلو پیڈیا آف امریکانا کے مقالہ نگار بسلسلہ CIVILIZATION کا کہنا ہے کہ :

"وادی نیل اور وادی سندھ میں بھی تمدن نے سمیریوں کے تمدنی اسٹرکچر کی طرح لیکن یکسر مختلف انداز میں سمیرین تہذیب کے جلد ہی بعد جنم لیا، اس بات کے ناقابل تردید شواہد موجود ہیں کہ سومیریوں اور قدیم مصریوں کے مابین تجارتی روابط تھے اور امکاناتی شواہد سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وادی سندھ میں ابتداءً جب تمدن نے سر ابھارا تو سندھیوں اور سمیریوں کے مابین بھی تجارتی مراسم تھے"[4]،

رواں صدی کے اوائل تک مورخین کا خیال تھا کہ مصری تمدن ہی سب سے قدیم ترین

تمدن ہے اور بعض معاصرین بھی وادی نیل کے تمدن ہی کو نوع انسانی کا اولین گہوارہ خیال کرتے ہیں[5] لیکن تاریخ نگاروں کی اکثریت نے اس رائے سے اتفاق نہیں کیا بلکہ ان کا خیال ہے کہ تمدن کی داغ بیل عراق میں ڈالی گئی اور اس پہلو سے سمیریوں کو شرف اولیت حاصل ہے، وہ سامی الاصل نہیں تھے بلکہ سامیوں سے بہت پہلے تمدن کی برکات سے روشناس ہو چکے تھے۔ ان کا تمدن پانچ ہزار سال قبل مسیح تک کا پرانا ہے[6]۔

مندرجہ بالا تاریخی شہادت کے بپیش نظر مذکورہ تمدنوں میں نظام جرم وسزا کا جائزہ لیتے ہوئے زیر نظر مقالہ میں بابلی تمدن کو سر فہرست رکھا گیا ہے۔

۱۔ قدیم بابلی تمدن

قدیم بابلی تمدن میں نظام جرم وسزا کیا تھا اور کن کن جرائم کو اس وقت بھی سخت قابل سزا سمجھا جاتا تھا اور ان کے لیے کیا سزائیں مقرر تھیں ؟ اس کا اندازہ اس دور کے قانون کے مطالعہ ہی سے ہوسکتا ہے۔ بابلی تمدن کے مجموعہ قانون کا جو حصہ اب تک منظر عام پر آیا ہے وہ دسمبر ۱۹۰۱ء جنوری ۱۹۰۲ء کے دوران ایران کے ایک قدیم شہر "سوس" کی کھدائی کے دوران دریافت ہوا جسے "قانون حمورابی" کہا جاتا ہے[7]۔ قانون حمورابی جو پتھر کے ٹکڑوں پر کندہ تحریری شکل میں دستیاب ہوا، یہ ایک قدیم قانونی دستاویز ہے جس کے بارے میں ماہرین آثار قدیمہ کا کہنا ہے کہ حمورابی بادشاہ نے پتھر کے مینار پر یہ قوانین کندہ کرائے تھے[8]۔ حمورابی حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت سے کوئی دو ہزار سال قبل عراق (بابل) کا بادشاہ گزرا ہے۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہم عصر تھا۔ عہد نامہ قدیم میں اس کا ذکر ملتا ہے۔

معروف مصری اسکالر عبدالسلام الترمانینی کہتے ہیں :

"وضع ھذا القانون الملک حمورابی اشہر ملوک بابل (وھو سادس ملوک

بابل) عام ۲۰۰۰ ق م، وهو مجموعته لتقليهم ترجع الى عهد اقدم بكثير من العهد الذی وضع فيه، وقد اكتشفته بعثته فرنسيه اثريه فی مدينة سوس (دولی الايرانيه)، عام ۱۹۰۲ م ووجد منقوشا على مسلة حجريه اسطوانيه الشكل محفوظة فی متحف اللوفر بباريس...[9]

قانون حمورابی میں جن جرائم کا ذکر ہے ان میں سرقہ، زنا، حرابہ اور قذف شامل ہیں[10]۔ بابلی تمدن کے قوانین سے متعلق دریافت ہونے والی تحریروں میں سے یہ مفصل ترین تحریر ہے[11]۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ قانون حمورابی سے قبل بھی قدیم (عراق) بابل میں قوانین کا وجود تھا[12]۔ چنانچہ قدیم بابلی قوانین میں سے جو کچھ اب تک دریافت ہو سکا ہے ان میں "اورنمو" کے قانون کو قدیم ترین مانا گیا ہے، فوزی رشید کہتے ہیں:

"الملک اورنمو یعتبر موسس سلالته اور (URR) الثالثة ۲۱۱۱-۲۰۰۲ ق م) والذی بدا حکمه ۲۱۱۱ ق م وشریعته تعتبر فی الوقت الحاضر اقدم شریعته معروفته لدی الانسان[13]"

(ارنمو بادشاہ کو تیسرے خاندان ار (۲۱۱۱-۲۰۰۲ ق م) کا بانی سمجھا جاتا ہے جسکا دور اقتدار ۲۱۱۱ ق م سے شروع ہوا اور موجودہ دور میں دنیائے انسانیت میں اسی کے مجموعہ قوانین کو سب سے قدیم ترین مانا گیا ہے۔)

علاوہ ازیں قدیم بابلی تہذیب میں قانونی ارتقاء کی ایک شکل قانون "ایشنونا" ہے جو بغداد کے قریب دجوار کی کھدائی کے دوران ۱۹۴۵ء میں دریافت ہوا، فوزی رشید لکھتے ہیں:

"فی عام ۱۹۴۵ م قامت مدیریته الآثار العامته بتنقیبات فی موقع حرمل الواقع فی مدینته بغداد ووجدا لوحان مدونان بقانون ایشنونا وهذان اللوحان باللغته السامیته البابلیته[14]"

(۱۹۴۵ء میں ڈائرکٹریٹ جنرل آثار قدیمہ نے بغداد میں واقع ایک مقام "حرمل" کی کھدائی کے دوران دو ایسی تختیاں دریافت کیں جو قانون ایشنونا پر مشتمل تھیں اور یہ دونوں تختیاں بابل کی سامی زبان میں تھیں۔)

۲۰۱۷ ق م سے ۱۷۹۴ ق م کے عرصہ میں بابلی تہذیب جس قانون کے تابع تھی وہ "لبت عشتار" (LIPT ISHTAR) کے نام سے موسوم ہے۔ لبت عشتار "ایسن" نسلی کا پانچواں بادشاہ گزرا ہے، امریکن جورنل آف آرکیولوجی کے حوالہ سے فوزی رشید لکھتے ہیں:

لبت عشتار هو خامس ملوک سلالته ایسن (۲۰۱۷-۱۷۹۴ ق م) وحکم من ۱۹۳۴ ق م - ۱۹۲۴ ق م، اما اللغته التی کتبت بها الشریعته هی اللغته السومریته رغم ان مقننها سامی الاصل ولیس سومریا، وفی عام ۱۹۴۷ء عام کشف النقاب عن شریعته لبت عشتار...[15]

(لبت عشتار خاندان ایسن ۲۰۱۷-۱۷۹۴ ق م کا پانچواں بادشاہ ہوا ہے اس نے ۱۹۳۴ ق م سے ۱۹۲۴ ق م تک حکومت کی۔ قوانین کا دریافت شدہ مجموعہ سومارین زبان میں ہے باوجودیکہ اس کا بنانے والا اصلاً سامی نسل کا ہے اور سومری نہیں ہے۔ ۱۹۴۷ء میں لبت عشتار کا قانون منظر عام پر آیا)

محولہ بالا مجموعہ قوانین میں جرائم حدود اور ان کی سزائیں مذکور ہیں، چونکہ یہ مجموعہ ہائے قوانین مکمل نہیں مل سکے بلکہ ان میں سے بعض کے بعض حصے ہی دریافت ہو سکے ہیں، اس لیے اس دور کے جرائم حدود کی مکمل تصنیفات سامنے نہیں آسکیں، تاہم دستیاب ہوا ہے

یہ تو واضح ہوتا ہے کہ اس دور قدیم میں بھی کم و بیش یہی جرائم قابل مواخذہ شدید متصور ہوتے تھے اور ان کی کڑی سزائیں مقرر تھیں۔ ذیل میں ان کا ترتیب وار تفصیلی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

حد زنا اور قدیم بابلی تمدن فعل زنا قدیم بابلی تمدن میں قبیح خیال کیا جاتا تھا اور زانی وزانیہ کے لیے حالات وزمانہ کی رعایت کرتے ہوئے سزا مقرر تھی تاہم فعل زنا کی انتہائی سخت سزا "قتل" یعنی سزائے موت مقرر تھی، قدیم بابلی قانون' قانون ارنمو میں زنا کی سزا کا ذکر ملتا ہے' قانون ارنمو کا ضابطہ نمبر ۴ اور ۵ جو کہ زنا سے متعلق تھا (کا عربی ترجمہ حسب ذیل ہے۔)

(اذا غوت زوجة رجل بمفاتنها رجلا اخر بحيث انه جامعها، فللزوج الحق فی ان يقتل المراة (زوجة) ولكن يجب اطلاق سراح الرجل الذی اغوته تلك المراة [۱۷]

(اگر کسی کی بیوی کسی غیر شخص کو اپنے دامن فریب میں اس طرح گرفتار کرے کہ وہ اجنبی شخص اس سے جماع کر بیٹھے تو اس عورت کے شوہر کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی (اس بدکار) بیوی کو قتل کر ڈالے' جبکہ اس زانی شخص کو جسے اس عورت نے پھسلایا ہو چھوڑ دیا جائے گا)

زنا بالجبر کی سزا اس سے بھی مختلف تھی، لونڈی سے زنا کرنے والے پر پانچ شیقل چاندی جرمانہ لگایا جاتا تھا۔

اذا ازال رجل بكارة امة رجل اخر بالاكراه' عليه ان يدفع (كغرامة) خمسة شيقلات من الفضة [۱۸]

(یعنی اگر کوئی مرد کسی دوسرے مرد کی بیوی کی بجبر بکارت زائل کر دے تو اس پر لازم

تھا کہ وہ چاندی کے ۵ شیقل جرمانہ ادا کرے)

جبکہ آزاد لڑکی کی زنا بالجبر کی سزا موت تھی (ضابطہ نمبر ۱۳۰)

شادی شدہ عورت اگر مرتکب زنا ہوتی تو اسے باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا تھا تاہم اگر اس کا شوہر یا بادشاہ معاف کرنا چاہتا تو اسے معافی کا اختیار تھا۔ قانون حمورابی کا ضابطہ نمبر ۱۲۶ اس سلسلہ میں یوں ہے:

اما المراة المتزوجة التی تزنی فتلقی مقيدة فی النهر الا اذا عفا عنها زوجها او يخلی الملك سبيلها [۱۹]

(یعنی شادی شدہ زانیہ عورت کو باندھ کر دریا میں ڈالا جاتا۔ ہاں اگر اس کا شوہر اسے معاف کر دیتا یا بادشاہ اسے چھوڑ دیتا تو خلاصی ممکن تھی۔)

قانون ایشنونا میں بھی زنا کی سزا موت مقرر تھی جیسا کہ اس قانون کے ضابطہ نمبر ۲۹ میں ہے:

اذا قبض علی الزوجة فی حضن رجل آخر فيجب ان تقتل [۲۰]

(اگر کوئی بیوی کسی دوسرے شخص کے جرنوں سے پکڑی جائے تو اسے قتل کرنا چاہیے)

زنا کے الزامات کا تدارک کرنے کی غرض سے قانون ایشنونا میں زواج شرعی کی تعریف درج تھی تاکہ شرعی اور غیر شرعی جوڑوں میں تمیز ہو سکے، قانون کا ضابطہ نمبر ۱۲۸ اس کی وضاحت اس طرح کرتا ہے:

اذا تزوج رجل امراة بدون سوال ابيها وامها ولم يقم بوليمة ليلة ولم يكتب (بذلك) عقدا مختوما مع ابيها وامها فلا تكون هذه المراة زوجة شرعية حتی لو عاشت فی بيته سنة كاملة (المادة الثامنة والعشرون من قانون ايشنونه) [۲۱]

(انوار)

یعنی جب کوئی شخص کسی لڑکی سے بغیر اس کے والدین کی رضامندی کے شادی کرے اور شب زفاف کے بعد ولیمہ کا اہتمام نہ کرے اور نہ ہی لڑکی کے والدین کا دستخط شدہ یا مہر کردہ کوئی وثیقہ نکاح لکھوائے تو ایسی لڑکی اس کی شرعی (قانونی) بیوی متصور نہ ہوگی اگرچہ وہ سال بھر اس کے گھر میں پڑی رہے۔

اس سے متصل ضابطہ نمبر ۲۹ میں ہے کہ:

اگر ولیمہ شب زفاف میں اہتمام کیا جائے اور لڑکی کے والدین سے وثیقہ نکاح لکھوا لیا جائے تو اس صورت میں یہ لڑکی اس کی قانونی بیوی ہوگی اور جب بھی کسی دوسرے شخص کے پہلو میں پائی جائے گی تو اسے سزائے موت دی جائے گی۔ اسے زندہ نہ چھوڑا جائے گا۔

اس ضابطہ کے (عربی ترجمہ کے) الفاظ یوں ہیں:

ولكن اذا اقام وليمة ليلة الزفاف وكتب العقد مع ابيها وامها ودخل بها فانها (في هذه الحالة) زوجة شرعية يوم يقبض عليها في حضن رجل اخر يجب ان تموت ولا تستمر في قيد الحياة (المادة التاسعة والعشرون من شريعة وقانون ايشنونتة)[۲۱]

اس طرح قدیم بابلی تمدن کے قوانین میں زنا بالتراضی، زنا بالجبر، زانی محصن، زانی غیر محصن، زنا بالحرۃ اور زنا بالامۃ کی سزائیں مقرر تھیں۔

۲۔ قدیم مصری تمدن | قدیم مصری تمدن میں نظام عقوبات کیا تھا اس کے بارے میں تاریخ کے صفحات مصدقہ معلومات بہت کم فراہم کر سکے ہیں جو کچھ فراعنہ مصر کے دور سے متعلق مواد قدیم تاریخی دستاویزات سے محفوظ کیا جا سکا ہے اس سے کسی مدون و مرتب مجموعہ قوانین کا پتہ نہیں چلتا۔ اس صورت حال پر گفتگو کرتے ہوئے مصر کے ایک معروف ماہر قانونیات

محمد موسی مہران لکھتے ہیں:

"ومن اسف ان معلوماتنا عن شئون القضاء في مصر قليلة وبينما ومن الناس قوانينهم في بابل لم تصل الينا صورة واحدة لاى قانون مصري كتب على بردية من عصر الدولة القديمة وليس معنى هذا ان المصريين لم يعرفوا القانون بل اننا لا زلنا نعتقد هذه الوثيقة التي لابد وانها كانت موجودة ولم تصل الينا بعد۔"[۲۲]

(افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ (قدیم) مصر میں رائج نظام قضاء کے بارے میں ہماری معلومات بہت کم ہیں۔ جس زمانہ میں بابل میں لوگوں نے اپنے قوانین مرتب کیے اس دور قدیم کے کسی مصری نسخہ قانون تک ہماری رسائی نہیں ہوسکی لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ عہد قدیم میں مصر کے لوگ کسی قانون سے نابلد تھے بلکہ ہمارا اب بھی یہ خیال ہے کہ اس دور کا کوئی نہ کوئی مرتب شدہ قانون ہوگا اور اس کی باقاعدہ تحریری دستاویز بھی ہوگی جواب تک ہمیں دستیاب نہیں ہوسکی۔)

قدیم مصری قانون کے بارے میں کچھ اس طرح کے خیالات کا اظہار دیگر مورخین نے بھی کیا ہے۔ مثلاً اکبر شاہ خان نجیب آبادی کہتے ہیں کہ:

"مصر قدیم کا کوئی مجموعہ قوانین بائیبل یا منوسمرتی کی طرح مرتب و مدون اگرچہ موجود نہیں تاہم مصر کے حالات جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے چودہ سو (۱۴۰۰) سال قبل کی تاریخوں کے ذریعہ معلوم ہوسکے ہیں ان سے کچھ نہ کچھ اندازہ قوانین مصر قدیم کا کیا جا سکتا ہے۔"[۲۳]

مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ قدیم مصر کے بادشاہوں کی حیثیت دیوتاؤں

کی تھی اور وہ پورے ملک کے مختار کل تصور کیے جاتے تھے۔ تاہم نظام حکومت چلانے کے لیے بہت سے عہدیدار مقرر تھے۔ متحدہ مصر میں کوئی تحریری قانون نہ تھا بلکہ بادشاہ مات (MAAT) کے اصولوں کے مطابق حکم صادر کرتا تھا[۲۴]۔ مات کے اصولوں کی روشنی میں دیوانی و فوجداری قوانین بھی تھے، زنا قابل سزا جرم تھا اور اس کی سزا بہت سخت تھی، بعض مجرموں کو کوڑے بھی مارے جاتے تھے۔ ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان کاٹنے کا قانون بھی رائج تھا۔ جلاوطنی کی سزا بھی تھی، زندہ جلا دینا، سولی دینا اور گلا گھونٹنا اور گردن مارنے کا بھی رواج تھا، سب سے سخت سزا زندہ ممی بنا دینے کی تھی، جان و مال کی حفاظت اور قانون پر عمل درآمد کرنا فرعون کے اہم ترین فرائض میں سے تھا[۲۵]۔ ذیل میں اسکے دستیاب بعض تاریخی شواہد پیش کیے جاتے ہیں:

قدیم مصری تمدن اور جرائم کی سزائیں

(۱) جرم زنا: زنا مصری تمدن میں جرم اور سخت قابل سزا تھا اور زانی و زانیہ کو دریا برد یا نذر آتش کر دیا جاتا تھا، گویا انتہائی اذیت ناک طریقہ سے سزائے موت دی جاتی تھی۔ محمد بیومی مہران کہتے ہیں:

"وصلتنا بعض احکام من قانون العقوبات فی بردیة وستکار حیث کان یکتب علی الزانیة والزانی الموت غرقا او حرقا ففی روایتها عن علاقة الشاب بامراة کاهن ان الشاب قد افترسه تمساح من صنع الکاهن نفسه وان المراة المذنبة انما قد اقتیدت الی ساحة شمالی القصر حیث احرقت علنا والقی برمادها الی النهر ولعل ذلک کان عقاب الزانیة المحصنة وعلی ای حال من الاحوال فهناک مایشیر الی تخفیف هذه العقوبة فیما تلا ذلک من العصور فاصبحت جدع الانف"[۲۶]

(بعض قوانین سے پتہ چلتا ہے کہ زانی اور زانیہ کو دریا برد کرکے یا نذر آتش کرکے سزائے موت دی جاتی تھی، اس سلسلہ میں ایک روایت یوں ملتی ہے کہ ایک نوجوان کا کسی کاہن کی بیوی سے ناجائز تعلق قائم ہوگیا۔ چنانچہ کاہن نے اس نوجوان کو مگرمچھ کے منہ میں ڈلوا دیا جبکہ اپنی فاحشہ بیوی کو محل کے شمالی میدان میں جلوا دیا اور اسکی راکھ کو دریا میں ڈال دیا گیا۔ غالباً یہ زانیہ محصنہ کی سزا تھی تاہم بہت سے شواہد اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ اس جرم کی سزا میں بعد کے زمانوں میں تخفیف ہوتی چلی گئی تاآنکہ صرف ناک کاٹنے پر اکتفا کیا گیا۔)

انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس کے مطابق مصر کے ایک شخص اباتیر کا واقعہ ہے کہ اس کی بیوی نے کسی دہقانی سے زنا کر لیا۔ چنانچہ دہقان کو مگرمچھ کو کھلا دیا گیا اور عورت کو پبلک کے سامنے زندہ جلا کر اس کی راکھ دریا میں بہا دی گئی[۲۷]۔

اسی طرح ایک اور واقعہ میں ایک عورت کے اپنے دیور سے زنا کرنے کی خواہش کا اظہار کرنے اور دیور کے انکار پر عورت کی طرف سے اس پر تہمت لگانے اور عورت کے خاوند کی طرف سے عورت کو کتوں کے آگے ڈلوانے کا ذکر بھی ملتا ہے[۲۸]۔

علاوہ ازیں قدیم مصری تہذیب میں ایک دستور یہ بھی رہا کہ اگر کسی عورت کے پاس اس کے گھر میں کسی اکیلے غیر مرد کو پایا جاتا تو اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا، کبھی بدکار عورت کی زبانیں گدی سے کھینچ لی جاتی تھیں اور زنا بالجبر کے مجرم کو آختہ کر دیا جاتا تھا۔ الغرض قدیم مصری معاشرہ میں مختلف اوقات و اماکن میں مختلف النوع سزائیں رائج تھیں تاہم قدیم مصری تہذیب میں زنا نا قابل مواخذہ جرم کبھی نہیں رہا۔

(۲) جرم سرقہ اور حرابہ: چوری قدیم مصری معاشرہ میں ناسور کی شکل

اختیار کر چکی تھی اور اس کے نت نئے طریقے ایجاد کیے جاتے تھے۔ بعض تاریخی مصادر اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اس دور میں چوری کو کوئی بڑا جرم نہیں سمجھا جاتا تھا، اکبر شاہ خان نجیب آبادی کے بقول:

"مصر میں چوری کوئی بڑا جرم نہیں سمجھا جاتا تھا، بلکہ وہاں چوری کا ایسا عجیب وغریب طریقہ رائج تھا کہ جس کی نظیر دنیا کے کسی ملک اور کسی قوم میں تلاش نہیں کی جا سکتی جس کی تفصیل یہ ہے کہ جو شخص پولیس کا افسر اعلیٰ ہوتا وہی چوروں کا سب سے بڑا سرغنہ بھی ہوتا تھا جو شخص چوری کا پیشہ اختیار کرتا وہ اپنا نام اور پتہ مذکورہ افسر اعلیٰ کے دفتر میں درج کرا دیتا اور جب چوری کرتا تو اس کی پوری کیفیت یعنی چوری کرنے کا وقت اور مال مسروقہ کی مالیت وغیرہ بھی آکر درج کرا دیتا، اب جس کا مال چوری کیا گیا ہے وہ شخص جب پولیس افسر کے یہاں آکر چوری کی اطلاع کرتا اور سراغ رسانی کی التجا کرتا تو وہ پولیس افسر چوری کے مال کی چوتھائی قیمت بطور تاوان اصل مالک سے وصول کرکے مال اس شخص کو دلا دیتا۔ وصول شدہ تاوان میں سے کچھ حصہ چور کو مل جاتا اور کچھ سرکاری خزانہ میں داخل ہوتا، گویا چوری کو ایک جائز پیشہ قرار دے دیا گیا تھا۔"[29]

عموماً ڈکیتی اور چوری کی سزائیں معمولی ہوتی تھیں تاہم کسی مستند ذریعہ سے ان کی کیفیت کا علم نہیں ہو سکا۔ جرائم قذف و شرب خمر کے سلسلہ میں تاریخی وقدیم مصری مصادر خاموش ہیں۔ مصر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ورود کے بعد قانونی ارتقاء کا عمل شروع ہوا اور بہت سے قدیم قوانین کی جگہ الہامی قوانین نے لے لی۔ چنانچہ زنا، سرقہ، قذف اور حرابہ وغیرہ کی سزائیں تورات میں مذکور ہیں جن کا ذکر "حدود شرائع سابقہ میں" کے

عنوان سے شامل مقالہ ہے۔

۳۔ قدیم تمدن روما اور جرائم رومن تہذیب قدیم تہذیبوں میں سے ایک ہے اس کا اپنا ایک مجموعۂ قوانین ہے جسے بارہ الواح کا قانون کہا جاتا ہے اس قانون میں سرقہ اور رہزنی (حرابہ) کا ذکر ملتا ہے۔ سر ہنری سمینز مین قدیم قانون روما کے بارے میں لکھتے ہیں:

"قدیم اقوام کا قانون فوجداری قانون جرائم نہیں بلکہ وہ قانون افعال ناجائز ہے اگر اس کے لیے انگریزی اصطلاح استعمال کی جائے تو یہ ٹارٹ (TORT) یعنی قانون ہرجہ کہلائے گا، قانون روما کی ابتدا سرقہ سے ہوتی ہے اور وہ خلاف ورزیاں جنھیں ہم خالص جرائم سمجھنے کے عادی ہیں افعال قابل ہرجہ متصور ہوتے ہیں، مقننین نے صرف سرقہ ہی کو نہیں بلکہ حملہ اور سخت رہزنی (حرابہ) کو بھی مداخلت بیجا۔ ازالہ حیثیت عرفی اور غلط الزام کے ساتھ ملا دیا ہے"[30]

گویا رومن تہذیب میں جرائم سخت قابل سزا نہیں بلکہ معمولی جرائم سمجھے جاتے تھے اور ان کی سزائیں جرمانوں تک محدود تھیں۔ بارہ الواح کے قانون کے مطابق سرقہ کو دو اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔ سرقہ FURTUM ۲۔ سرقہ بالجبر (حرابہ) ROPINA۔

اگر چور سرقہ ظاہرہ کرتا یعنی سرقہ کے وقت مقام سرقہ سے گرفتار کر لیا جاتا تو اسے سزائے تازیانہ دی جاتی بشرطیکہ وہ مال مسروقہ سمیت جائے واردات سے گرفتار ہوا اور اگر مال مسروقہ لے کر اپنے گھر پہنچ جائے تو یہ سرقہ غیر ظاہرہ سمجھا جاتا تھا، سرقہ ظاہرہ میں تازیانہ لگانے کے بعد سارق مالک مال کا غلام بنا لیا جاتا اور اگر کوئی غلام سرقہ کرتے ہوئے پکڑا جاتا تو اسے پہاڑی سے گرا دیا جاتا اور گرانے سے قبل سزائے تازیانہ دی جاتی۔ بعد میں اس میں

تخفیف کردی گئی اور آزاد یا غلام دونوں کو مال مسروقہ کا چار گنا لے کر چھوڑ دیا جاتا تھا[31]

قدیم رومن ایمپائر ۷۵ ق م سے ۲۱۲ ق م میں رائج قانون رومانی کے مطابق سزائیں حکام کے جذبہ تسکین کی خاطر دی جاتی تھیں اور وہاں مقصود جرم کی اصلاح یا معاشرہ کی فلاح نہیں ہوتا تھا۔[32]

قدیم رومن تہذیب میں شراب نوشی عام تھی اور زنا پر کوئی پابندی نہ تھی، ول ڈیوران تمدن روما کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "قانونی طور پر ایک سے زیادہ شادی کرنے پر پابندی تھی مگر جنسی خواہشات کی تسکین کا مکمل سامان موجود رہتا تھا"[33]

ول ڈیوران کہتے ہیں پروکوپیوس (PROCOPIUS) نے اپنی کتاب سیکرٹ ہسٹری (SECRET HISTORY) میں لکھا ہے کہ "اس کے زمانہ کی تمام عورتیں عملاً بدکار تھیں، قحبہ خانے عام تھے اور زناکاری کا کاروبار کھلے بندوں جاری تھا"۔ جسٹینین اور اس کی ملکہ نے عصمت فروشی کو ختم کرنا چاہا، انہوں نے عصمت فروشی کا دھندا کرنے والے مرد وزن کو قسطنطنیہ سے نکل جانے کا حکم دیا لیکن انہیں کوئی خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی[34]

۴۔ قدیم تمدن ہند اور جرائم کی سزائیں | ہندوستان کی ہندو اقوام وید اور منوسمرتی کو بائبل کی طرح اپنے قدیم صحیفے خیال کرتی ہیں، ایرانیوں کے مہرآبادی صحائف موجود نہیں ژندواوستا کے جو اجزا موجود ہیں وہ بہت مشتبہ اور ناکافی ہیں جن سے یہ اندازہ کرنا خاصا دشوار ہے کہ اس دور میں نظام حدود (جرم وسزا) کیا تھا[35] تمدن ہند کی قدامت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مورخین نے اس کی اساس منوسمرتی کو ہزاروں لاکھوں بلکہ کروڑوں سال قدیم کہا ہے۔

کلیات آریہ مسافر صفحہ ۰ کالم ۲ کے مطابق منوسمرتی بارہ کروڑ سال قبل کی تصنیف

ہے ایک سابق گورنر بمبئی مسٹر الفنسٹن اپنی کتاب تاریخ ہند میں منوسمرتی کو ۹۰۰ ق م کا بتاتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ منوسمرتی کا مصنف منوجی حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے نوسو برس قبل گزرا ہے۔

ڈبلیو ڈبلیو ڈاکٹر ہنٹر جو کہ امپیریل گزٹ آف انڈیا کے ڈائریکٹر تھے اپنی کتاب تاریخ ہند میں کہتے ہیں کہ منوسمرتی ۵۰۰ ق م میں تصنیف ہوئی جبکہ زردشت کے بارے میں مورخین کا خیال ہے کہ یہ ۱۲۰۰ ق م یا اس سے بھی قبل ہوئے ہیں[36]

تمدن ہند کے بارے میں مختلف آرا پائی جاتی ہیں، میکڈونلڈ کا خیال ہے کہ یہ تمدن سمیریا کی فرع تھا جبکہ ہال کے خیال میں سمیریا کا تمدن بذات خود ہڑپائی تمدن کی ایک شاخ ہے، تاہم یہ بات یقینی ہے کہ وادی سندھ کے جہاز ران بحری سفر کرکے سمیریا بابل تک جایا کرتے تھے اور اس بات کے شواہد بھی موجود ہیں کہ جب مصر میں بڑا اہرام تعمیر کیا گیا اس وقت ہڑپا اور موئن جو داڑو کا تمدن عروج پہ تھا۔ وادی سندھ کا تمدن جس کے آثار موئن جو داڑو اور ہڑپا سے ملے ہیں جناب مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے تین ہزار برس پہلے موجود تھا[37]

قدیم ہندی تمدن اور جرم سرقہ | منوسمرتی میں جسے ہندو اپنی تہذیب کا سرمایہ قانون و تمدن اور دھرم شاستر بتاتے ہیں بعض تعزیرات کا ذکر ہے، سرقہ کے بارے میں منوسمرتی میں مختلف النوع سزائیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً:

"خاندانی عورت یا عمدہ جواہر کو اگر کوئی چرالے تو اسے قتل کر ڈالنا چاہیے"[38]

"جو چور نقب زنی کرکے رات میں چوری کرتے ہیں ان کے دونوں ہاتھ کاٹ کر ان کو تشہیر کرنا چاہیے، جو چور اول مرتبہ گرہ کاٹے اس کی انگوٹھے کے پاس کی انگلی کاٹنا چاہیے، دوسری مرتبہ ارتکاب جرم ہو تو ہاتھ یا پاؤں کاٹنا چاہیے اور

تیسری مرتبہ قتل کرنا مناسب ہے۔[39]

" برہمن کی گائے چرانے والے کا آدھا پاؤں کاٹ لینا چاہیے "[40]

منو نے یہ تجویز کیا کہ اگر کوئی شودر چوری کرے تو وہ بطور جرمانہ مال مسروقہ کی قیمت کا آٹھ گنا ادا کرے جبکہ ویشیوں، کشتریوں اور برہمنوں کے لیے بھی جرمانہ مال مسروقہ کی مالیت کا علی الترتیب سولہ گنا، بتیس گنا اور چونسٹھ گنا تجویز کیا گیا ہے۔[41]

البیرونی ہندوستان کے جرم و سزا کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

" اما السرقۃ فعقوبۃ السارق بمقدارھا فانھا ربما اوجبت التنکیل بالفراط والتوسط وربما اوجبت التادیب التغریم وربما اوجبت الاقتصار علی الفضیحۃ والتشھیر فان کان المقدار عظیما سمل الولاۃ البرھمن او قطعوہ من خلاف و قطعوا کشتو ولم یسملوہ وقتلوا غیرھا[42]

گویا چوری کی سزا مال مسروقہ کی مالیت کے پیش نظر اور ذات پات کی تقسیم کے لحاظ سے ہوتی تھی، اگر مالیت بہت زیادہ ہوتی تھی تو راجا برہمن چور کو اندھا کر دیتا تھا اور اس کا دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹ دیتا تھا۔ کھشتری چور صرف اندھا نہیں کیا جاتا تھا باقی پوری سزا اسے دی جاتی تھی۔

ہندوستان میں چوروں کی سزا کے مختلف طریقے مختلف اوقات میں رائج رہے۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک لمبی لکڑی کے دونوں کناروں کو تیز کر کے اس کی دھار بنا دی جاتی تھی اور چور کو اس پر بٹھا دیا جاتا تھا تاکہ لکڑی اس کے جسم میں گھس جائے نیز رہزنوں کو قتل کرنے کا رواج بھی تھا۔[43]

حوالہ جات

۱ شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ ۲-۶۱۱ ۲ Will Durant The Story of Civilization P 1 ۳ W. H. Mcneill Encyclopaedia Americana Vol 7 P 3 ۴ ایضاً ۵ پیر محمد کرم شاہ الازہری، ضیاء النبی، ج ۱، ص ۵۴ ۶ علی عباس، روایات تمدن قدیم، ص ۱۲ ۷ فوزی رشید الشرائع العراقیہ القدیمہ ص ۱۳ ۸ عبد القیوم جالندھری، قوانین اسلامی ممالک، ص ۵۰ ۹ عبد السلام الترمانینی، محاضرات فی تاریخ القانون، ص ۵۲ نیز فوزی رشید، الشرائع العراقیہ القدیمہ، ص ۸۱ ۱۰ ایضاً ۱۱ ایضاً ۱۲ ایضاً ۱۳ ایضاً ۱۴ ایضاً: نیز American Journal of Archaelogy V II No. 3 (July - Sept 1984) ۱۵ فوزی رشید، الشرائع العراقیہ القدیمہ، ص ۳۸ ۱۶ ایضاً: ص ۱۷ ۱۷ ایضاً ۱۸ سامی سعید المدخل الی التاریخ العالم القدیم، ج ۲، ص ۲۵۲ ۱۹ ایضاً ۲۰ فوزی رشید، الشرائع العراقیہ القدیمہ، ص ۶۶ ۲۱ ایضاً ۲۲ محمد بیومی مہران، تاریخ الشرق الادنی القدیم، ص ۲۲۵ ۲۳ اکبر شاہ خان نجیب آبادی، مقدمہ تاریخ ہند، ج ۲، ص ۸۹ ۲۴ سراج الاسلام، عہد قدیم و جدید، ص ۴۴ ۲۵ ایضاً ۲۶ محمد بیومی مہران، تاریخ الشرق الادنی القدیم، ص ۲۲۶ ۲۷ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس، ج ۱، ص ۱۲۷ ۲۸ ایضاً ۲۹ نجیب آبادی اکبر شاہ خان، مقدمہ تاریخ ہند، ج ۲، ص ۹۱ ۳۰ سر ہنری سمر مین، قدیم قانون روما، ص ۳۱ ۳۱ احمد عبد اللہ المسدوسی، قانون روما، ص ۱۶۵ ۳۲ فرید وجدی، دائرۃ المعارف القرن الرابع العشرین، ج ۳، ص ۸۰ ۳۳ سمیح عاطف الزین، لمن الحکم، ص ۲۰ ۳۳ پیر محمد کرم شاہ الازہری، ضیاء النبی، ج ۱، ص ۴۰ ۳۴ ایضاً ۳۵ نجیب آبادی اکبر شاہ خان، مقدمہ تاریخ ہند، ج ۲، ص ۷۷ ۳۶ ایضاً: ص ۹۰ ۳۷ علی عباس، روایات قدیم، ص ۱۸۴ ۳۸ نجیب آبادی اکبر شاہ خان، مقدمہ تاریخ ہند، ج ۲، ص ۱۲۳ (بحوالہ منوسمرتی ۸، ۳۲۳) ۳۹ ایضاً ۴۰ ایضاً ۴۱ الباشم - AL-BASHEM ہندوستان کا شاندار ماضی، ص ۱۶۹ - ۴۲ البیرونی، تاریخ الہند، ص ۵۴۷ ۴۳ مناظر احسن گیلانی. ہزار سال پہلے، ص ۵۹-۶۰

ملفوظاتِ اقبال کی ادبی اہمیت

از ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی ندوی، علیگڑھ

علامہ اقبال (۱۸۷۷-۱۹۳۸ء) بڑے جامع کمالات شخص تھے۔ علوم اسلامی پر ان کی نظر اتنی ہی گہری تھی جتنی علوم عصری پر، جس طرح تہذیب مشرق کے وہ رازداں تھے ویسے ہی مغربی ثقافت کے رمز شناس تھے، وہ انسانی نفسیات کے جس قدر ماہر نباض تھے اسی قدر اقوام وملل کی نفسیات کے گہرے ماہر تھے۔ ڈاکٹر صاحب تصورات ومعتقدات مبادیات وحقائق اور تحریکات ومذاہب سے بھی پوری طرح باخبر تھے۔ فلسفہ وحکمت تو ان کی گھٹی میں پڑے تھے، وہ زبان وادب کے اداشناس اور مزاج داں تھے۔ کئی زبانوں پر ان کو ماہرانہ قدرت تھی، ان کے دل ودماغ اور ذہن وعقل کے دریچے بھی کھلے ہوئے تھے اور وہ وجدان، الہام، جذب دروں اور کیفیات قلب کی دولت ربانی سے بہرہ ور بھی تھے۔

ان کے ملفوظات انہی کثیر الجہات اور رنگارنگ پہلوؤں سے معمور ہیں۔ بقول سید نذیر نیازی:

"... معمولی سے معمولی مسائل، معمولی سے معمولی واقعات اور حوادث سے پھیلتے پھیلتے اسلام، عالم اسلام، تاریخ، تمدن، سیاست اور معیشت سب پر چھا گئی۔ انسان، کائنات، علم وعقل، فکر ووجدان، ادب اور فن سب اس کی زد میں ہیں۔ اس پر حضرت علامہ کا حسن بیان، صاف وسادہ اور دلنشیں الفاظ، فصاحت وبلاغت، برجستگی

اور بے ساختگی، توجہ اور التفات، شفقت اور تواضع، خلوص اور دردمندی کہ جو ارشاد ہے دل میں اتر رہا ہے، جو بات ہے ذہن میں بیٹھ رہی ہے۔ پھر انکا انکسار علم، شگفتگی اور زندہ دلی کہ ادعا ہے نہ تعلّی، نہ غرور نہ تمکنت۔ متانت بھی ہے تو ظرافت کی چاشنی سے خالی نہیں ..." (اقبال کے حضور، ص ۹)

سر دست ہم کو ان کے تنوع، رنگا رنگی اور بوقلمونی سے سروکار نہیں ہے بلکہ صرف ان کا ادبی تجزیہ کرنا مقصود ہے، اس سے بھی موضوعات ومضامین کی بوقلمونی کا جلوہ سامنے آئے گا۔ عام شہرت یہ ہے کہ اقبال کی نظم شان وشکوہ اور ادبی لطافت ورعنائی سے معمور ہوتی ہے لیکن اس کے مقابلے میں ان کی نثر روکھی پھیکی اور بے کیف ہوتی ہے، گو یہ تاثر عام ہے مگر گہرے مطالعہ کا نتیجہ نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی نثر بھی ادبیت سے عاری نہیں ہوتی ہے، برجستہ وبرمحل ہونے کی وجہ سے ملفوظات میں بے ساختگی، برجستگی، آمد، بے تکلفی اور روانی تو ہوتی ہی ہے۔ پھر اقبال کوئی عام شخص نہ تھے اور نہ ان کے سامعین وحاضرین مجلس معمولی اشخاص ہوتے تھے، بلکہ ان میں تعلیم یافتہ، مہذب اور رچے بسے ذوق کے حامل جیدہ اصحاب علم ونظر ہوتے تھے اور خود میر مجلس حکیم الامت شاعر، فلسفی اور ادیب۔ لہٰذا ان کی زبانی نثر یعنی ملفوظات کا ادبی محاسن سے آراستہ ہونا فطری اور لازمی تھا۔

ملفوظات تاریخی ترتیب کے مطابق دن وار یا تاریخ وار مرتب کیے جاتے ہیں اور یہ آسان اور ایک طرح سے اچھا طریقہ ہے لیکن ان کے تجزیے کے لیے خواہ وہ ادبی مقصد سے ہو موضوعاتی طریقہ زیادہ مستحسن نظر آتا ہے کہ اس میں خیالات وافکار کے تسلسل وتناسب، فکر ونظر کی ہم آہنگی وہم رنگی، علم وفن کی پرورش وبالیدگی، حکمت وفقاہت کی نشوونما وغیرہ ہماری نگاہوں کے سامنے آتی ہیں اور صاحب ملفوظات کی عظمت ومرتبہ کے شاہد

عدل ہونے کے علاوہ قاری و سامع کے لیے جنت نگاہ اور فردوس گوش بنتی ہیں۔ لہذا ہم اس مختصر مقالے میں حکیم الامت کے ملفوظات کا ایک موضوعاتی تجزیہ کریں گے۔

حضرت علامہ اسلام کے حدی خواں اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے مداح تھے۔ وہ اسلامی فلسفۂ حیات کو صرف بازیافت کر کے اس کا قصیدہ ہی لکھنا پڑھنا نہیں چاہتے تھے بلکہ سارے عالم میں اور تمام انسانوں میں اسکو خون حیات کی مانند جاری ساری کرنا اور افراد و طبقات کی رگوں میں آبِ حیات بنا کر دوڑانا بھی چاہتے تھے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ملفوظات عالیہ کے تجزیہ کا آغاز کلام الٰہی پر ان کے خیالات و ارشادات سے کیا جائے جو باعث سعادت و برکت بھی ہے

قرآنیات سے متعلق ارشادات | مطالعۂ قرآن کریم کے تعلق سے حضرت علامہ کا ارشاد گرامی ہے کہ:

"قرآن پاک کا مطالعہ کیجئے تو اس کا مقابلہ دوسرے مذہبی صحائف سے بھی کرتے جائیے، یوں اس کا فہم زیادہ آسان ہو جائے گا۔ عہد نامۂ عتیق میں ہے: خداوند نے زمین و آسمان کو چھ دنوں میں پیدا کیا، ساتواں دن خداوند کے آرام کا تھا، اس کے مقابلے میں قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ بے شک زمین و آسمان کی پیدائش چھ دنوں میں ہوئی مگر اللہ تعالیٰ کو آرام کی ضرورت پیش نہیں آئی ... یہ لفظ خداوند بھی بڑا غور طلب ہے۔ ... ایسے ہی ہندو اور بدھ دھرم کے تصورات ہیں، مثلاً مایا اور آنند۔ قرآن مجید نے ان کے برعکس حقیقت اور فلاح پر زور دیا ہے..."

علامہ موصوف تقابلی مطالعۂ صحائف کے بغیر بھی قرآن کے صحیفۂ ہدایت ہونے کے قائل تھے: "... قرآن سر تا سر ہدایت ہے اور ہر حال میں رہنما۔ یہ کتاب اللہ ہے اور لفظ کتاب غور طلب ہے:

اس کے بعد فہم قرآن و تفہیم کتاب الٰہی کے راستوں کی نشاندہی اس طرح فرماتے ہیں:

"بات اصل میں یہ ہے کہ قرآن مجید قلب کے راستے سے بھی شعور میں داخل ہوتا ہے اور دماغ کی راہ سے بھی سمجھ میں آتا ہے۔ دماغ کی راہ سے سمجھ میں آنے کا مطلب ہے حقائق کا ادراک، علم اور فکر، تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں .... حقائق کا ادراک ہوتا رہا اور ہوتا رہے گا۔ قرآن مجید ان سب حقائق کا جامع ہے جو ہمارے ادراک میں آ چکے ہیں اور ان کا بھی جن کا ادراک باقی ہے۔ خواہ یہ حقائق سنوسی کی زبان سے ادا ہوں خواہ لینن کی، حقائق بہر حال حقائق ہیں۔ ان کو سمجھنے کی جس طرح بھی کوشش کی جائے اپنی جگہ پر ٹھیک ہے۔ مقصد ہے ان کا سمجھنا اور قبول کرنا۔ لہذا انہیں جس طرح بھی سمجھیں یہ قرآن پاک ہی کا سمجھنا ہوگا۔ ..." (اقبال کے حضور اول: ص ۵۹-۵۶)

تفسیر قرآن مجید کے بارے میں حضرت اقبال ایک فلسفیانہ اصول وضع کرتے ہیں اور حقائق قرآنی کو بشری شعور سے جوڑ کر فرماتے ہیں:

"ان آیات میں جن حقائق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، ان کا فہم تو آسان ہے، لیکن غلطی یہ ہے کہ ہم ان کی تاویل شعور کے اس مرحلے کی رعایت سے کرتے ہیں جس سے سردست ہمارا گزر ہو رہا ہے، حالانکہ تاویل سے مقصود کسی حقیقت کو سمجھنا اور اس کی تہ تک پہنچنا ہے ... تاویل اور موضوع تاویل میں لازم و ملزوم کا تعلق ہے؛ ایک منطقی، حقیقی اور واقعی رشتے کا تعلق۔ یہ نہیں کہ ہم اسے اپنے ہی خیالات اور مرغوبات کی تائید کا ذریعہ بنائیں۔" (اقبال کے حضور اول، ص ۶۴-۶۳)

مفسرین کی تفسیر اسلام و قرآن کی ایک غلطی کو مفکرین کے حوالے سے یوں واضح کرتے ہیں: "... مفکرین اسلام نے البتہ اس باب میں جو غلطی کی وہ یہ کہ یونانیت کے زیر اثر اس نکتے

کو نظر انداز کر دیا جو خودی میں مضمر ہے ....." (اقبال کے حضور اول ص۱۴۳)

حکیم الامت کی انگلی ہمیشہ قوم اور اس کے اکابر کی نبض پر رہتی تھی اور نگاہ حق اور صرف حق پر۔ وہ اس باب میں خاص کر قرآن کریم اور اسلام کی تعلیمات کے باب میں کسی مصلحت، سہل انگاری یا مداہنت کے قائل نہ تھے، مجلس میں ایک بار جب تفسیر قرآن کریم اور بعض دوسرے موضوعات کے حوالے سے مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن کا ذکر آگیا اور ساتھ ہی مدیر معارف حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس پر تبصرہ کا تو مبصر گرامی قدر اور صاحب تفسیر سامی کے فضل و علم اور بصیرت و حکمت کے بہمہ وجوہ قائل ہونے کے باوجود حضرت علامہ نے اپنی بے لاگ رائے کا اظہار کیا۔ اس کا ایک سبب یہ تھا کہ مبصر گرامی نے اپنی رائے میں تبدیلی کر کے مفسر اور صاحب تفسیر کے بارے میں خاموشی اختیار کرنے کی مصلحت کا ذکر کیا تھا۔ وہ علامہ اقبال کی رائے ہی نہیں ایک اہم اصول تفسیر بھی ہے کہ متاخرین اسی طرح اپنے جلیل القدر متقدمین کی غلطیوں پر پردہ ڈالتے ہیں:

"یہ امر بڑا افسوسناک ہے کہ کسی شخص کا علم و فضل یا احترام ذات ہمیں حق گوئی سے باز رکھے اور وہ بھی ان مسائل میں جن کا تعلق اسلام کی بنیادی تعلیمات سے ہے۔" (اقبال کے حضور اول: ص ۵۳-۵۲)

حدیث و سنت نبوی ملفوظات اقبال میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حدیث و سنت کے تعلق سے اسی طرح ادبی جواہر ریزے ملتے ہیں جن کی ادبیت کے ساتھ ساتھ معنوی بلاغت و فصاحت اور مقصدی حکمت بھی ایک امر مسلم ہے۔ اہل علم و صاحبان دل پر یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ حضرت اقبال کو قرآن مجید سے نزول کتاب کا تعلق تھا۔ اسی طرح ان کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ عشق تھا۔ ان کا عشق،

ان کی شیفتگی اور ان کی محبت وجدانی ہی نہیں شعوری بھی تھی اور یہ شعور و وجدان ان کی حکمت اور علم و فضل سے سیراب ہوئے تھے اور ان کے جذب دروں کے بحر ناپید اکنار سے بھی۔ ان دونوں عظیم و گرامی موضوعات پر اپنے والد ماجد کی تعلیم کا ذکر اپنے الفاظ عالیہ میں یوں فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کا ارادہ عالم انسانیت کو جس معراج کمال تک پہنچانے کا تھا، اس کا آخری اور کامل و مکمل نمونہ ہمارے نبی اکرم محمد مصطفےٰ احمد مجتبیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات ستودہ صفات میں ہمارے سامنے پیش کر دیا۔ لہذا ہم کہیں گے کہ آدم علیہ السلام سے حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم تک کے خاتم الانبیاء ہیں، جتنے بھی نبی مبعوث ہوئے، ان میں سے ہر ایک کا گزر مدارج محمدیہ ہی میں سے ہو رہا تھا۔ وہ گویا ایک سلسلہ تھا، جس کا خاتمہ ذات محمدیہ کی تشکیل پر ہوا۔" (اقبال کے حضور اول ص۱۱)

شعور نبوت کے بارے میں ان کا حکیمانہ ارشاد ہے:

"شعور نبوت کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس میں زمانے کی ساری وسعتیں سمٹ کر ایک نقطے پر آجاتی ہیں، ماضی و حال اور مستقبل کا امتیاز قائم نہیں رہتا۔ لہذا ہمارے لیے جو بات آنے والی ہوتی ہے شعور نبوت کو پہلے ہی اس کا علم ہوتا ہے اسی طرح جیسے اس کا ظہور ہو رہا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام ہر حقیقت اور ہر صداقت کو اپنے سامنے عیاں رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے وحی الٰہی میں ان کے کامل یقین کی۔ لہذا جس علم کا سرچشمہ ہے وحی الٰہی اس میں یقین ہی یقین ہوگا..." (اقبال کے حضور اول ص ۶۲)

اسی بنا پر حضرت اقبال سنت نبوی کے کامل اتباع میں فوز و فلاح دیکھتے ہیں:

"جہاں تک فرد کی ذات اور معاشرے کی تہذیب و ترقی یا دوسرے لفظوں میں معراج انسانیت کا تعلق ہے یہ مقصد حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع ہی سے

حاصل ہوگا۔ البتہ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ کوئی بھی نصب العین ہو اس کے لیے یقین کامل شرط ہے۔ یقین نہیں تو عمل بھی نہیں، نہ آرزو، نہ ولولہ، نہ جدوجہد۔" (اقبال کے حضور، اول ص ۹۲)

جدید اور اسلامی قانون

علامہ اقبال معاصر جدید قانون کے ایک مسلمہ ماہر تھے اور اسلامی قانون فقہ پر بہت گہری نظر رکھتے تھے، ان کی ایک دوسری خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ ان دونوں قوانین کے تقابلی مطالعہ، جائزہ اور تجزیہ کے علاوہ ان دونوں کی روح سے آشنا تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ٹھیٹ علمائے کرام اور فقہائے عظام ان کے بعض فرمودات، ارشادات اور معتقدات سے مطمئن و متفق نہ ہوں:

"اسلامی فقہ کی رو سے جائیداد میں، خواہ اس کی نوعیت کچھ بھی ہو، وقف یا غیر وقف منقولہ اور غیر منقولہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا نہ اس پر کوئی حق ملکیت قایم ہوسکتا ہے، نہ قانون جدید املاک کا اطلاق ممکن ہے۔ دراصل ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے فقہا نے زمین کے مسئلہ میں جو کچھ لکھا ہے اس کا تحقیقی مطالعہ کیا جائے پھر ماہرین فن موجودہ حالات کی رعایت سے اس مسئلہ پر غور کریں۔ زمین کی بہرحال یہ حیثیت نہیں کہ ہم اس پر عام اشیائے استعمال کی طرح افراد کا حق ملکیت تسلیم کریں۔"

مفکر اسلامی کا خیال تھا کہ فقہ کے مسائل ہوں یا سیاسی نظریات و معاملات یا زندگی کا کوئی اور شعبہ "شریعت کا فہم روز بروز کم ہو رہا ہے۔ اسلامی شریعت کی جڑیں حقائق میں ہیں۔" "... احکام شریعت کا تعلق صرف فرد کی ذات سے تو نہیں، جماعت سے بھی ہے۔ احکام شریعت جس طرح حیات فرد کے ضابطہ ہیں بعینہ انسانی معاشرے کے صورت گر اور اس کی ترقی کے ضامن۔ ان سے روگردانی اسلام سے روگردانی ہے۔" (اقبال کے حضور اول ص ۱۲۳، ص ۲۹-۲۸،

ص ۳۱۹ اور ص ۳۳۳ بالترتیب)

فقہ و کلام، شریعت اور متعدد دوسرے موضوعات سے فن استقرار کا تعلق جڑا ہوا ہے:

"استقرار مسلمانوں کی ایجاد ہے، اسلام ہی نے خیالی کے مقابلہ میں حقیقی اور مجرد کے برعکس محسوس پر زور دیا۔ تجربہ و مشاہدہ اور علم و عقل کو ادراک حقیقت کا ذریعہ ٹھہرایا۔ انسان کو دعوت دی کہ اپنی استعداد علم سے کام لے۔ استقرار کی روایت عالم اسلام سے شروع ہوتی ہے۔" (ایضاً ص ۱۱۱)

کلام مسلمانوں کی ایجاد ہے اور اس کا نشوونما عالم اسلام سے مخصوص۔" ... یہ صحیح ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں میں بھی متکلمین پیدا ہوئے اور انہوں نے کوشش کی کہ اپنے عقائد کی تطبیق فلسفہ یونان سے کریں۔ لیکن بات دراصل یہ ہے کہ مسلمانوں سے پہلے الٰہیات کا کہیں وجود ہی نہیں تھا ... یہ کلام نہیں اس کو لاسئنزم ہے۔ ہمیں دونوں میں فرق کرنا چاہیے ..." (ایضاً: ص ۱۱۳-۱۱۲)

علامہ شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی اور متعدد دوسرے اہل نظر نے سیرت نگاری اور سوانح نویسی کو جدید علم کلام کا ایک شعبہ قرار دیا تھا، مفکر ملت اسلامی نے اسے اجتماعیت یا علم عمران کی شاخ اور امت کی شیرازہ بندی اور بلند اقبالی کا ایک ذریعہ قرار دیا:

"ہمیں بھی اہل یورپ کی طرح اپنے رجال اور مشاہیر کی شخصیتوں پر قلم اٹھانا چاہیے مگر افسوس ہے ہم میں کوئی سیرت نگار ہے نہ کسی کو سیرت نگاری کے فن سے دلچسپی ہے حالانکہ سیرت نگاری حیات ملی کے استحکام کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔" (ایضاً ج ۲-۳-۲)

امت کی زبوں حالی

جس ملت کے وہ مفکر اور جس امت کے وہ مصلح و قائد تھے، اس کی فلاح و بہبود، شیرازہ بندی، دینی و دنیاوی ترقی پر انہیں جتنی خوشی ہوتی تھی اس سے کہیں زیادہ

اس کی پامالی، بربادی اور زبوں حالی پر رنج و اندوہ ہوتا تھا، وہ ہر ممکن طریقے سے اس کی فکری رہنمائی کی سبیل نکالتے، عملی قیادت کی راہ سجھاتے، اس کی شیرازہ بندی اور اجتماعیت کی فکر کرتے اور اس کی گزشتہ عبقریت اسے واپس دلانے کی کوشش کرتے۔ اس عظیم ملی مسئلہ پر ان کے ارشادات عالیہ اور ملفوظات سامیہ آب زر سے لکھنے کے لائق ہیں۔ "قوموں کی زندگی کا راز اس جدوجہد میں مضمر ہے کہ اپنا وجود ملی قائم رکھیں اور نہیں بھولیں کہ ان کا ایک اپنا نصب العین ہے۔ لہذا اس موقع پر جب یہ کوشش کی جارہی ہے کہ ہماری جداگانہ قومیت کو ہمیشہ کے لیے ختم کردیا جائے ہمیں اپنے موقف کا اعلان دلیری سے کرنا چاہیے۔

"... دراصل ہماری مشکل یہ ہے کہ ہم اپنے ملی نصب العین صحت کے ساتھ متعین نہ کرسکے۔ ہماری نظر زیادہ تر اخلاقی اور مذہبی مسائل پر رہی اور ہم سمجھے کہ یہی بہ مقابلہ دوسروں کے ہمارا مابہ الامتیاز ہے۔ اس میں کچھ حالات کو بھی دخل ہے، کچھ ہمارے زوال اور تاریخی روایات کو۔ یہی وجہ ہے کہ ہم وہ قیادت پیدا نہ کرسکے جس کی آج ہمیں ضرورت ہے" (ص۴۸-۹) ... بحیثیت ایک نظام مدنیت اسلام ابھی تک ہمارے سامنے نہیں آیا یہ نظام مدنیت ایک نہ ایک دن سامنے آئے گا لیکن اس وقت جب مسلمانوں کا شعور ملی بیدار ہوگا اور وہ سمجھیں گے کہ حیات عبارت ہے، ایک سیاسی اجتماعی ہیئت (سے) نہ کہ محض ایک اخلاقی، مذہبی نظام سے ... (ص۷۶) سیاسی جوڑ توڑ سے کچھ نہیں ہوتا، ہوگا تو یونہی کہ مسلمانوں کی سیاسی اور اجتماعی تحریکات میں اسلام کا رنگ پیدا ہو... ضرورت ہے اسلامی نظام مدنیت کے احیا کی (ص۱۱۷) ہماری کوشش بہرحال یہ ہونی چاہیے کہ اپنے دل و دماغ اور سیرت و کردار میں وہ رنگ پیدا کریں جس کی اسلام نے تلقین کی ہے اور جس میں شریعت کا اتباع لازم ٹھہرتا ہے ..." (ص۱۵۱)

شاعر مشرق اور فلسفیٔ اسلام نے اسلامی امت کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ وہ فن تاریخ کے مقصد اور وسائل سے بھی واقف تھے اور اس کے صحیح طریق مطالعہ اور قومی زندگی میں اسکے صحیح مقام سے۔ امت اسلامی کوئی ایک محدود جغرافیائی حقیقت نہیں ہے بلکہ وہ آفاقی اور عالمی حقیقت ہے جس کی بنیاد و اساس عقیدہ پر ہے نہ کہ وطن، زبان، رنگ، رسم، رواج یا کسی اور چیز پر۔ حکیم الامت نے اسی لیے پہلے اصل اسلامی امت اور نبوی ریاست کا گہرا مطالعہ کیا جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے میثاق مدینہ اور مواخاۃ کی بنیادوں پر قائم کی تھی اور سارے عالم میں پھیلی ہوئی آفاقی امت اسلامی کو بطور کل اور اس کے مختلف حصوں۔ ملتوں کو بطور جزو دیکھا اور سمجھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ارشادات میں ہندی ملت کے ساتھ دوسری ملتوں کا ذکر بھی ملتا ہے اور ان کی ساخت پرداخت اور انحطاط و زوال کا تجزیہ بھی:۔

" عرب و عجم دونوں ہمارے ماضی کا تار و پود ہیں۔ ہم عرب کو نظر انداز کرسکتے ہیں نہ عجم کو۔ ہمیں چاہیے ماضی کی تنقید یں مستقبل کو فراموش نہ کریں۔ ... اسلام بنائے قومیت ہے اور اس کا سرچشمہ ہے رسالت، لہذا اسلام ایک سیاسی اجتماعی معاشرہ ہے" (ص۲۵ اور ص۲۱۳) ... اسلام سے پہلے قوموں کی تشکیل جس اصول پر ہورہی تھی اسلام نے اسے تسلیم نہیں کیا اور آج بھی وہ اصول جسے بنائے قومیت ٹھہرایا جاتا ہے ہمارے لیے قابل تسلیم نہیں۔ ... ہمیں تو قومیت کے اس جدید تصور سے اختلاف ہے جو مغرب کے سیاسی فکر کی پیداوار ہے اور جس کا آغاز لوتھر کی تحریک سے ہوا۔ یہ تصور سرتاسر کفر ہے ..." (ص۲۱۹-۲۰)

حضرت علامہ کو اندلس کی تاریخ سے بہت دلچسپی بلکہ شیفتگی تھی:

" اسپین کو اسلامی تاریخ سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ لیکن اسپین کی تاریخ ابھی تک پردۂ خفا

میں ہے۔ ... اسپین کیا، مسلمان اپنی ساری تاریخ سے بے خبر ہیں۔ ... ص۲۹۲ اندلس اور صقلیہ میں مسلمانوں کی تباہی امت کے ایک جزو کی تباہی تھی۔ امت کا وجود تو بہرحال قائم ہے۔ البتہ یہ ٹھیک ہے کہ قومیں پیدا بھی ہوتی رہتی ہیں اور مر بھی جاتی ہیں۔ قرآن پاک کا بھی یہی فیصلہ ہے۔" (ص ۱۹۶)

حکیم الامت کا تجزیہ بجا ہے کہ اسلامی روح کی پامالی نے یہ دن دکھائے تھے۔

"... یہ حقیقت سامنے آئی کہ یہ صرف تقلید اور فقہی جمود ہی نہیں بلکہ منجملہ اس کے اور بھی کئی خرابیاں ہیں جن سے اسلام کی روح پائمال ہو رہی ہے مثلاً ملوکیت، خانقاہی علم و حکمت کا زوال، سیاسی اور معاشی ابتری، مغربی تہذیب اور مغربی شہنشاہیت کے غلبہ و استیلاء کا بڑھتا ہوا ریلا ..." (ص۳۲)

ان کا خیال تھا کہ صورت حال کی اصلاح کے لیے داعیوں کے ساتھ ساتھ صحیح قیادت ضروری ہے۔

"عالم اسلام کے حالات بدل رہے ہیں، یوں بھی مسلمانوں میں اعلیٰ صلاحیتوں کی کمی نہیں۔ اسلام سے بھی ان کا رشتہ بہرحال قائم ہے، ان کی اصل ضرورت ہے قیادت، صحیح قیادت میسر آجائے تو وہ کیا کچھ نہیں کر سکتے۔ ... مجھے تو یوں نظر آتا ہے کہ انہیں میں سے کوئی صاحب ایمان اٹھ کھڑا ہو گا اور اس کا خلوص اور دیانت ساری قوم کو ایک مرکز پر جمع کر دے گا ... یہ محض خیال ہی خیال نہیں ہے، حقیقت ہے ..." (ص۴۶-۴۵)

مسلمانوں کی ترقی کا راز اور مغرب کے داؤں پیچ

اضمحلال، پسماندگی اور دربدری کو بالعموم قومی، ملی اور امتی زوال و انحطاط کا سبب قرار دیا جاتا ہے اور یہ صحیح بھی ہے۔ لیکن اس کے نتیجہ میں ترقی، اقدام اور حرکت کا جو تصور و نمونہ پیش کیا جاتا ہے وہ خطرناک مضرات اور گمراہ کن

امکانات کا حامل ہے۔ حضرت حکیم الامت کا خیال و عقیدہ اور اعلان تھا کہ اسلام ہی مسلمانوں کی ترقی کا راز ہے جسے بالعموم سربستہ سمجھا جاتا ہے مگر ہے وہ بالکل برجستہ و علانیہ۔ صحیح ملی نشوونما اور امتی ترقی کے لیے اسلامی شریعت کی تابعداری، پیروی اور شیفتگی لازمی ہے۔ یورپ و مغرب کی ترقی کو نہ صرف کھوکھلا اور بے بنیاد سمجھتے تھے بلکہ فرمایا کرتے تھے کہ جن قوموں نے اسکو اپنایا وہ قعر مذلت میں ضرور گریں گے اور خود یورپ کا حال اسی کے سبب ابتر ہے۔ ترقی کے خود ساختہ انسانی تصور کے متعلق حکیمانہ اصول بیان فرماتے ہیں:

"بعض اوقات بات تو ذرا سی ہوتی ہے لیکن انسان اپنے مستقبل سے کہیں دور ہٹ جاتا ہے۔ ہم ایک قدم اٹھاتے ہیں۔ سمجھتے ہیں آگے بڑھیں گے لیکن یہی قدم ہمیں پیچھے لے جاتا ہے، ایک چیز ہاتھ آتی ہے خیال ہوتا ہے بہت بڑی نعمت مل گئی لیکن آگے چل کر وہی چیز زنجیر پا ہو جاتی ہے اور انسان ہے کہ بے بس ہو کر رہ جاتا ہے"۔ (ص۳۰)

یہ حکیمانہ ارشاد ترقی اور بالخصوص یورپی مغربی ترقی ہی پر صادق نہیں آتا بلکہ انسانی فطرت اس کی مساعی اور اعمال کے بارے میں بھی اتنا ہی صحیح ہے۔ معاملہ سارا انسان کی اپنی سوچ و سمجھ کا ہے جو محدود ہے ہر لحاظ سے، وقت سے، تصور سے، زمان سے، مکان سے اور حالات و واقعات کے بہاؤ سے۔ اس پر مستزاد ہے فیصلۂ ربانی اور تقدیر الٰہی۔ جب اتنی ساری چیزوں سے انسان لاعلم ہے تو وہ اپنی سمجھ پر کتنا بھروسہ کر سکتا ہے یا اسے کرنا چاہیے، دوسری حکیمانہ بات یورپ کے بارے میں یہ ارشاد فرمائی:

"اطمینان قلب بڑی نعمت ہے اور یہی نعمت ہے جو یورپ نے اپنی مادیت پرستی میں کھو دی ہے (ص۲۳)۔ ... انگریز بڑا کائیاں ہے۔ سیاست کے داؤں پیچ خوب سمجھتا ہے اس نے وہاں بھی جود و سخا سے کام لیا جہاں وفاداری میں ابھی محکومی پر قناعت اور

رضامندی کا رنگ پیدا نہیں ہوا تھا۔ (ص۲۴) "غلامی اور محکومی بہت بڑی لعنت ہے حکومت اور اقتدار ایک سحر ہے جس سے محکوموں کے دل و دماغ ماؤف ہو جاتے ہیں ... انسان جب کسی تہذیب سے متاثر ہوتا ہے تو اس کی اچھی بری باتیں سب اختیار کر لیتا ہے۔ مغربی تہذیب کی نقالی اور اس کے ظاہری اور سطحی پہلوؤں کی دل کشی بجائے خود ایک مصیبت تھی۔ مغربی تعلیم نے ہمارے لیے اور بھی فتنے پیدا کر دیے ... آج کی بات اور ہے۔ آج اس تعلیم کے مضر نتائج ہمارے سامنے ہیں جسے کبھی ترقی کا واحد ذریعہ ٹھہرایا جاتا تھا۔ ہم اس تعلیم کا ماتم کہاں کہاں نہیں کرتے۔ سیاست میں اخلاق میں، فکر و فرہنگ میں، تمدن اور معاشرت میں۔ لیکن اس کی خرابیاں تو ابتدا ہی سے عیاں تھیں، یہ دوسری بات ہے کہ یوں دلوں میں جو فساد پیدا ہوا اس کے اثرات بہت آگے چل کر سامنے آئے"۔ (ص ۲۶-۲۵)

مفکر اسلامی کے ان خیالات، افکار اور ارشادات سے جو یورپی مغربی تہذیب، جدید تعلیم اور اس کے جلو میں آنے والی خباثتوں سے ہر صاحب علم و فضل واقف ہے لیکن ان کے ارشادات کی اہمیت یہ ہے کہ وہ دانائے راز، آشنائے حقیقت، محرم درون خانہ اور فیلسوف و حکیم کے تجربات و مشاہدات اور تجزیوں پر مبنی ہیں جبکہ بیشتر مغربی علماء و فضلاء کے ارشادات محض ان کے خیالات اور سنی سنائی باتوں پر منحصر ہوتے ہیں، اس کو علامہ اقبال انگریزیت یا افرنجیت سے تعبیر کرتے تھے کہ بے بنیاد یا بے خبری کے خیالات پر کسی طرح کا تجزیہ تیار کیا جائے۔ جدید تعلیم اور فرنگی تہذیب نے جو تصورات و افکار، خیالات و مبادیات اور رجحانات و میلانات جنم دیے تھے ان کا بہترین ادراک صرف انہیں کو تھا کہ وہ دونوں جہان کے مرد میدان تھے۔ اس کھوکھلی مگر بظاہر پرکشش تہذیب نے ہمارے عظیم ترین علماء اور اہل علم کو بھی منفی انداز سے بڑی حد تک متاثر کیا تھا۔ ان اثرات میں سے ایک قومیت کا تصور تھا۔ مفکر اسلامی کا خیال

تھا کہ افرنجیت نے قومیت کا روپ دھار لیا ہے۔ اسی بنا پر وہ کانگریس کی لادینی سیاست یونینسٹ پارٹی کی وطن پرستی، قوم پرست مسلمانوں کی وطنی سیاست یا قومیت اور ان سے علمائے کرام کی سیاسی مرعوبیت پر شدید تنقید کرتے تھے۔

قومیت، وطنیت اور لادینیت ان تصورات و تحریکات کے بارے میں ان کے ملفوظات و ارشادات میں بہت مواد ہے جس کا صرف ایک ایک نمونہ پیش ہے:

"کانگریس کا موقف تو یہ ہے کہ ہندوستان ایک جغرافیائی وحدت ہے لہٰذا اس میں بسنے والے ایک قوم۔ مذہب افراد کا ذاتی معاملہ ہے۔ سیاست سے بے تعلقی۔ کانگریس کیسے گوارا کرے گی کہ حصول آزادی کے بعد وہ اس وحدت سے دست کش ہو جائے جس پر آج اسے اصرار ہے اور جس کی بنا پر وہ مسلمانوں کے جداگانہ ملی وجود سے انکار کر رہی ہے ... (ص۴۷) ... صوبوں میں اس قسم کی جماعت بندی ضرور ہو سکتی ہے جیسی آج یونینسٹ پارٹی نے قائم کر رکھی ہے لیکن اس کی ترکیب بھی وہی ہوگی جو اس پارٹی کی ہے، یعنی مفاد پرست عناصر کا اتحاد سیاسی، معاشی بنا پر۔ چنانچہ اس پارٹی کے سامنے صرف زمینداروں کا مفاد ہے ... یہ پارٹی بظاہر مسلمانوں کی نمائندگی کر رہی ہے۔ اس میں اکثریت بھی مسلمانوں کی ہے۔ لیکن اس کے مسلمانی عناصر اسلام ہی کے نام پر اسلام کی نفی کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کو بحیثیت مسلمان نہ اس سے کوئی فائدہ پہنچ رہا ہے نہ تقویت ... (ص۴۸) وطنیت پسند مسلمان تو خیر اپنی تعلیم و تربیت سے مجبور ہیں۔ ان کا دل و دماغ مغربی تعلیم کے زیر اثر اس حد تک بدل چکا ہے کہ وہ کسی دوسرے رنگ میں سوچ ہی نہیں سکتے، یوں ہی دنیا میں ہر کہیں وطنیت کا غلبہ ہے اور بلاد اسلامیہ میں بھی یہ جذبہ ہر کہیں ابھر رہا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ محکوم قومیں جب

کسی قوم کے ہاتھوں اپنی آزادی کھو بیٹھتی ہیں اور دوسری قوموں کو آزاد یا آزاد
ہوتے دیکھتی ہیں تو ان کے اندر بھی قومی اور نسلی عصبیتوں کو تحریک ہوتی ہے، لہذا آج
کل کے نوجوان اگر نشۂ قومیت میں سرشار ہیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔
لیکن علماء کو کیا ہوگیا ہے؟ علماء کیوں نہیں سمجھتے کہ اسلام اور وطنیت ایک دوسرے
کی ضد ہیں، اسلام لاوطن ہے۔" (ص ۳۱)۔ ... ان میں علماء کا ایک گروہ بھی شامل ہے...
اس میں اگرچہ ان کی مخصوص فرقہ بندی اور انگریز دشمنی کو بھی دخل ہے لیکن اس کی اصل وجہ
ہے برسوں کے تعطل اور سیاست سے بے تعلقی کے خلاف وہ ردعمل جو انہیں مجبور کر رہا
ہے کہ سیاسی اعتبار سے بھی اپنی ہستی منوائیں... لیکن یہ جماعتی مفاد کا اس درجہ پاس
ہمارے ملی مفاد کے منافی ہے۔" (ص ۵)

حکیم و مفکر اور فلسفی کا ایک اہم میدان فکر اور جولانگاہ عقل مبادیات و تصورات اور
نظریات کا ہوتا ہے جہاں وہ اپنے علم و حکمت، فضل و بینش اور تدبر و تفکر کے جواہر ریزے
بکھیرتا چلا جاتا ہے۔ علامہ اقبال تو کل وقتی حکیم و مفکر تھے لہذا ان کے افکار و ارشادات میں ان
جواہر ریزوں کی شمولیت و موجودگی لازمی اور مستقل تھی۔ مختلف تصورات و افکار اور مبادیات
پر ان کے ملفوظات کو عنوان وار پیش کیا جا رہا ہے۔

الہام اور اس کے وقت کے بارے میں ان کا ایک طنزیہ جملہ ہے: "اب میں سمجھا...
صاحب کو پچھلی رات میں کیوں الہام ہوا کرتا تھا (ص ۲۵۵)

وحدت خیال کے بارے میں ایک ملفوظہ اقبال ہے کہ "خیال تو ایک ہی ہوتا مگر زمانہ
ہے کہ اپنے اپنے ذوق حیات اور احوال کے مطابق اسے مختلف شکلوں میں پیش کرتا ہے،
ہمیں اس نکتہ کو نظر انداز نہیں کرنا ہے۔" (ص ۶۶)

حق و صداقت کے حوالہ سے ان کا ایک ارشاد ایک دوسرے پس منظر میں گزر چکا ہے
اب دوسرا اسلام کے اصل الاصول کی حیثیت سے یہ ہے:

"یہ بہت بڑی غلطی ہوگی کہ جب ہم حق و صداقت پر زور دیں یا اسلام کے حوالے سے
اسے سمجھانے کی کوشش کریں تو اس طرح کہ بجائے اس کے کہ لوگ اسلام کی طرف
آئیں ہمارا اپنا ایمان و یقین اس میں مضمحل ہو جائے، حتی کہ بطور ایک ہیئت اجتماعیہ
اور نظام مدنیت کے کہ ہم اس کی جامعیت اور کلیت کو نظر انداز کر دیں۔ یہ سمجھیں کہ
یہ انسانی روابط ہوں یا تہذیب و تمدن کی دنیا، ہم اس میں اسلام کے پہلو بہ پہلو
دوسری گروہ بندیاں بھی قائم کر سکتے اور اس کے باوجود اپنا مخصوص نصب العین
اور جداگانہ تشخص برقرار رکھ سکتے ہیں۔ اسکا مطلب تو یہ ہوگا کہ ہم اسلام کو چھوڑ کر کبھی ایک
اصول حیات کا رخ کریں گے کبھی دوسرے کا۔ یہ امر تو دین کے منافی ہے۔ دین کا
ایک ہی اصل الاصول ہے اور وہ اسلام۔" (ص ۳۳-۲۳۲)

عشق کو بطور اصول کائنات اس طرح واضح فرماتے ہیں:

"... عشق ہی جوہر ہے زندگی کا۔ عشق ہی ہمارے جملہ مسائل کا حل اور مداوا ہے،
یہ ہمارا باہمی تعلق ہی تو ہے جس کی بدولت ہم ایک دوسرے سے ربط و ضبط اور اتحاد
و اشتراک پیدا کرتے ہیں۔ انسان کا انسان سے میل جول، ایک دوسرے کی الفت اور محبت
و مودت روزمرہ کی بات ہے اور یہی بات ہے جس سے زندگی کا کارخانہ چل رہا ہے۔
ہمارا کوئی جذبہ اتنا موثر نہیں جتنا عشق۔ عشق کی خاطر انسان بڑی سے بڑی
قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ عشق ہی ہر شئے اور وجود کا سہارا ہے اور عشق ہی
بطور ایک اصول کائنات میں کارفرما ہے۔" (ص ۱۶۳)

ختمِ نبوت کے بعد کے مدعیانِ نبوت

از جناب سید علیم اشرف جائسی۔ لیبیا

"خمسة عشر قرنا علی اختتام النبوة" کے عنوان سے ۱۲ نومبر ۱۹۹۱ء کو جمعیة الدعوة الاسلامیہ کے زیر اہتمام طرابلس میں منعقد ایک بین الاقوامی دینی علمی سمینار میں جو مقالہ پڑھا گیا تھا، ذیل میں اس کا ملخص ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے، مقالہ نگار مصر کے معروف عالم دین اور جامعة الازہر کے استاذ شیخ محمد السید البلاسی ہیں۔

جب انسانیت شباب و پختگی کی عمر کو پہونچ گئی تو گذشتہ شریعتوں کی تکمیل کرنے والے پیغام کے ساتھ حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، اللہ تعالٰی نے آپ کے ذریعے سلسلۂ نبوت و رسالت کا خاتمہ فرمایا اور قرآن کریم کو آسمانی کتابوں کا خاتم بنایا۔

وَمَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِنْ	محمد باپ نہیں کسی کا تمہارے مردوں
رِجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَسُولَ اللّٰهِ	میں سے، لیکن رسول ہے اللہ کا اور
وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ، وَكَانَ اللّٰهُ	مہر سب نبیوں پر اور ہے اللہ سب
بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا۔ (احزاب ۳۳: ۴۰)	چیزوں کا جاننے والا۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:

"میری اور انبیائے سابقین کی مثال ایسی ہے جیسے اس شخص کی مثال جس نے ایک گھر بنایا اور اس کی خوب تزئین و آرائش کی لیکن اس کے ایک کونے کی ایک

اینٹ نہیں لگائی، لوگ اسے دیکھتے اور پسند کرتے اور کہتے کہ: آخر تم نے یہ ایک اینٹ کیوں نہیں لگائی؟ حضور فرماتے ہیں کہ: میں ہی وہ اینٹ ہوں اور انبیاء کا خاتم ہوں" (مسلم شریف)

آسمانی کتابوں نے آپ کی آمد کی بشارت دی، حضرت امام احمد عطا بن یسار سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ میں عبداللہ بن عمرو بن عاص سے ملا اور ان سے کہا کہ مجھے تورات میں مذکور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات سے آگاہ کیجئے، انہوں نے کہا ٹھیک ہے، خدا کی قسم وہ تورات میں قرآن کریم کی ذکر کردہ صفات کے ساتھ متصف ہیں:

"اے نبی! ہم نے آپ کو گواہ، خوش خبری دینے والا، ڈرانے والا اور امیین (عرب) کے لیے پناہ گاہ بنا کر بھیجا ہے، آپ میرے بندے اور رسول ہیں اور میں نے آپ کا نام متوکل رکھا ہے"۔

حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی آپ کی بشارت دی، جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَا بَنِي	اور جب حضرت عیسٰی نے فرمایا اے
إِسْرَائِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ	بنو اسرائیل! میں تمہاری طرف اللہ کا
مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ	رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں، تورات کی
وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي	تصدیق کرتا اور اپنے بعد آنے والے
اسْمُهُ أَحْمَدُ ..." (صف ۶۱: ۶)	نبی کی بشارت دیتا ہوں، جن کا نام
	احمد ہوگا۔

اور احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی رسالت کے ساتھ تشریف لائے جس نے تمام گذشتہ رسالتوں کو منسوخ کر دیا، ارشاد ربانی:

قُلْ یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا (اعراف ۷: ۱۵۸) اے لوگو میں تم سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"اس ذات اقدس کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اس امت کا کوئی بھی یہودی اور عیسائی میرے بارے میں سُن کر بھی مجھ پر ایمان لائے بغیر اگر مرگیا تو وہ اہل نار میں سے ہوگا" (بخاری ومسلم)

اللہ تعالیٰ کا دین ایک ہے اور وہ ہے اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کے نبی اور انبیاء ومرسلین کے خاتم ہیں[1]

آغاز اسلام میں مدعیان نبوت

لیکن جھوٹی نبوت کی دعویداری کا سلسلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری عہد ہی میں شروع ہوگیا تھا، قبائلی عصبیت اور قریش سے سیادت، قیادت میں مقابلہ آرائی اس کا بنیادی محرک تھی، یمن میں اسود عنسی نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اس کے متبعین کی بڑی تعداد ہوگئی، مگر یہ تحریک اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے قبل ہی ٹھنڈی ہوگئی۔

یمامہ میں مسیلمہ بن حبیب نے جو مسیلمہ کذاب کے نام سے مشہور ہوا، اپنے نبی ہونے کا دعویٰ کیا، اس نے ہجرت کے دسویں سال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام

[1] دیکھئے: سیرت ابن ہشام، بیروت، دار التراث العربی، ۱۹۷۹ء، ۳: ۴۴۴، و السیرۃ النبویہ، ڈاکٹر عبدالمقصود وغیرہ، المطابع الامیریہ، ۱۹۸۹ء، ۳: ۳۳ ومعالم التاریخ الاسلامی، رشاد عبدالواحد، ص ۳۲، ۳۳۔

ایک خط میں لکھا کہ:

"مسیلمہ رسول اللہ کی جانب سے محمد رسول اللہ کے نام، آپ پر سلامتی ہو، میں آپ کے ساتھ اس امر (نبوت) میں شریک کیا گیا ہوں، نصف زمین ہمارے لیے ہے اور نصف قریش کے لیے لیکن قریش زیادتی کرنے والے ہیں"۔

اس خط کو لے کر مسیلمہ کے دو ایلچی حضورؐ کے پاس آئے، ابن اسحاق کہتے ہیں کہ:

"مجھ سے اشجع کے ایک بزرگ نے مسیلمہ بن نعیم بن مسعود اشجعی سے روایت کی ہے کہ ان کے والد نے کہا کہ: مسیلمہ کے خط کو پڑھنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں قاصدوں سے فرمایا کہ "تم دونوں کیا کہتے ہو؟" بولے وہی جو مسیلمہ نے کہا ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ: "خدا کی قسم، اگر ایسا نہ ہوتا کہ قاصدوں کو قتل نہیں کیا جاتا تو میں تم دونوں کی گردنیں اڑا دیتا" پھر آپ نے مسیلمہ کو خط لکھوایا:

"بسم اللہ الرحمن الرحیم، محمد رسول اللہ کی جانب سے مسیلمہ کذاب کے نام، سلامتی ہو ہدایت کی پیروی کرنے والوں پر، زمین اللہ تعالیٰ کی ہے، اپنے بندوں میں سے جسے چاہے اس کا وارث بنائے اور عاقبت پرہیزگاروں کے لیے ہے"۔

بنو اسد میں طلیحہ بن خویلد ظاہر ہوا اور نبوت کا دعویٰ کیا، حضورؐ کے وصال کے بعد یہ مسئلہ کافی سنگین ہوگیا، اسد، غطفان اور طئی کے قبیلے اس کے پیچھے چل پڑے۔

بنو یربوع کی ایک عورت نے بھی ادعائے نبوت کیا جس کا نام سجاح بنت حارث تمیمیہ تھا، متنبئ یمامہ مسیلمہ نے اس سے شادی کر لی تو سجاح اور تغلب کے اس کے ساتھیوں نے مسیلمہ کے ساتھ اتحاد کر لیا۔

حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں مرتدین سے قتال اور تحریک ارتداد کی سرکوبی کے لیے کیے گئے حملے کامیابی سے ہمکنار ہوئے، ان حملوں میں سب سے اہم اور شدید ترین معرکہ مسیلمہ اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ پیش آیا، مسیلمہ کی شکست اور قتل پر اسکا خاتمہ ہوا۔

عجیب بات ہے بعض مدعیان نبوت نہ صرف ہوش وخرد کی طرف لوٹ آئے بلکہ اسلامی فتوحات جیسے فتح عراق و فارس میں خوب داد شجاعت دی، حضرت طلیحہ اسدی بھی انھیں میں ایک تھے۔

اسلام سے منسوب جماعتوں کے بانیوں کا دعوائے نبوت

۱۔ سلسلۂ شیخیہ | احمد احسائی مولود، ۱۱۵۰ھ کو سلسلۂ شیخیہ کا بانی مرشد مانا جاتا ہے، یہ ایک باطنی متصوف تھا، جو مہدی منتظر کی تبلیغ کرتا تھا، احسائی کے مرنے کے بعد سلسلہ کی شیخیت کو اس کے شاگرد کاظم رشتی نے سنبھالا جس کی پیدائش ۱۲۰۹ھ/۱۷۹۵ء میں ہوئی تھی اور وفات ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء میں کربلا میں ہوئی[1]

۲۔ بابیت | رشتی کے مرنے کے بعد سلسلۂ شیخیہ کے پیروکار تین فرقوں میں تقسیم ہوگئے۔ جن میں سب سے مضبوط اور طاقتور فرقہ وہ تھا جس کی قیادت ملاحسین بشروئی کے ہاتھ میں تھی، احسائی اور رشتی کی بشارتوں کے مصداق مہدی منتظر کی تلاش میں ملاحسین اور ان کی جماعت نے شہروں شہروں کا گشت کیا اور اس جہاں گردی کا خاتمہ شیراز میں ہوا، جہاں ملاحسین کی ملاقات انتہائی عجیب وغریب انداز اور بجد مشکوک حالات میں علی محمد شیرازی نام کے ایک شخص سے ہوئی، ملاحسین نے دعوی کیا کہ

[1] المذاهب والافكار المعاصرة في التصور الاسلامي، محمد حسن، الدوحة: الموسسة العالمية للطباعة والنشر، بار اول، ۱۹۸۶ء، ۳۰۳۔

مہدی منتظر کی تمام تر صفات علی محمد پر منطبق ہیں، یہیں سے سلسلۂ شیخیہ ایک نئے موڑ میں داخل ہوا اور بابی تحریک اس کے قائم مقام ہوگئی، یہ واقعہ ۲۳ مئی ۱۸۴۳ء کو پیش آیا، علی محمد شیرازی نے باب کا لقب اختیار کیا اور ملاحسین بشروئی کو باب الباب کا خطاب دیا اور تحریک کے پہلے آٹھ داعیوں کو "حی" کا خطاب دیا گیا، جنھوں نے تحریک کی تبلیغ واشاعت کی۔

ڈاکٹر عبدالفتاح برکہ اپنی ایک تقریر میں اس تحریک کے بانیوں کی حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ: جب ۱۹۱۷ء میں زار روس کی حکومت کا خاتمہ ہوا تو کمیونسٹوں نے زار حکومت کی خفیہ رپورٹوں کو شایع کردیا، ایک رپورٹ کے مطابق حکومت نے دو مبلغوں کو فرضی ناموں سے ایران بھیج رکھا ہے، جن کے نام احمد احسائی اور کاظم رشتی ہیں، اس رپورٹ کے شایع ہوتے ہی حکومت برطانیہ نے تیزی کے ساتھ ان دونوں سے رابطہ کیا اور ان کی مالی مدد کی تاکہ ان کی تخریبی کوششوں سے فائدہ اٹھاسکے۔

ملاحسین بشروئی اور علی محمد شیرازی کی ملاقات میرے خیال میں کسی اتفاق کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ غالب گمان یہ ہے کہ شیرازی مغربی استعمار کے ایجنٹوں میں سے تھا اور نئے مرحلے میں تحریک کی قیادت کے لیے نامزد کیا گیا تھا، رشتی پہلے ہی سے اس سے واقف تھا اور اسے خفیہ کلمات سے آگاہ کردیا تھا اور اسی کے کہنے پر ہی شیرازی نے بشروئی سے ملاقات کی اور یہ دعوی کیا کہ اس کی صفات مہدی منتظر کی صفات کے مطابق ہیں اور ہوا بھی وہی جو رشتی نے چاہا تھا۔

بابی افکار وعقائد | محمد علی شیرازی نے ۲۵ سال کی عمر میں مہدی موعود ہونے کا دعوی

کیا مقامی اداروں نے اس کے اس دعوے کی ترویج واشاعت کی اور بہت سے لوگ اس کی سحر انگیزی کا شکار ہوگئے، اپنے استاد رشتی کے مرنے کے بعد اس نے اپنا نام "باب" رکھ لیا اور دعویٰ کیا کہ وہ اللہ تک پہونچنے کا راستہ ہے اور حدیث شریف: "انا مدینۃ العلم وعلی بابھا" (میں شہر علم اور علی اس کے دروازے ہیں) کی تاویل یہ کی کہ: "حدیث میں مذکور "علی" سے اسی کی ذات مراد ہے" [1]

پھر اس نے دعویٰ کیا کہ اس کی طرف وحی آتی ہے اور اس پر "بیان عربی" نامی اللہ کی کتاب نازل ہوئی ہے، اسی بنیاد پر اس نے تمام سابق شریعتوں کی منسوخی کا اعلان کیا، وہ تناسخ کا قائل اور بعثت کا منکر تھا، اپنی دعوت کی ترویج واشاعت کے لیے اس نے خواتین کا بھی استعمال کیا۔

ایران کے شہر قزوین کے برغانی خاندان بالخصوص ملا محمد اور اس کی بیٹی نے جسکا نام قرۃ العین تھا بابی مذہب قبول کر لیا، قرۃ العین بیحد خوبصورت اور ذہین تھی چنانچہ بابی تحریک میں اسے بہت اعلیٰ مقام حاصل ہوگیا۔

تونس کے ایک رسالے "جوھرۃ" نے اپنے چوتھے سال کے آٹھویں شمارے میں صفحہ نمبر ۹ پر قرۃ العین کی ایک تقریر نقل کی ہے، وہ کہتی ہے کہ:

"میرے احباب واغیار! باب کی پیروی کرنے والو اور نہ کرنے والو، سنو! جان لو کہ باب کے ظہور کے بعد شریعت محمدیہ کے احکام وقوانین منسوخ ہوچکے ہیں اور تمہارا نماز پڑھنا، روزہ رکھنا، زکوۃ دینا اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھئے: البابیۃ، عرض ونقد، احسان الٰہی ظہیر، لاہور، ادارۃ ترجمان السنۃ بار سوم، ۱۹۸۱ء، ۹۷۔

کے لائے ہوئے احکام پر عمل کرنا لغو اور بیکار ہے، آج کے بعد ان احکام پر صرف کوئی غافل یا جاہل ہی عمل کرے گا، عنقریب ہی ہمارے آقا باب تمام ممالک کو فتح اور تمام لوگوں کو اپنا مطیع کرلیں گے اور ساتوں اقالیم ان کے زیر نگیں آجائیں گے اور وہ جلد ہی روئے زمین پر موجود تمام مذاہب وادیان کو ایک کر دیں گے اور اس دین کے سوا کوئی دوسرا دین باقی نہ رہ پائے گا"

اس کے بعد قرۃ العین اباحیت کی دعوت دیتے ہوئے کہتی ہے کہ:

"اے لوگو! اپنے اور خواتین کے درمیان موجود حجاب کو ٹکڑے ٹکڑے کردو اور انہیں تمام اعمال وافعال میں اپنا شریک بنالو، انہیں دلبستگی کے لیے استعمال کرو اور خلوت سے باہر نکالو، عورتیں زندگی کا پھول ہیں اور پھول کی تخلیق توڑنے اور سونگھنے کے لیے ہوتی ہے، عورت کی تخلیق ہی ہم آغوشی اور بوس وکنار کرنے کے لیے ہے، اس زندگی میں جو کچھ میسر ہے اس سے لطف اندوز ہو کیونکہ مرنے کے بعد کچھ بھی نہیں ہے" [1]

اس میں حیات بعد الموت کا واضح انکار ہے۔

قرۃ العین نوخیزی کی عمر میں اپنے شوہر کے ہمراہ حصول علم کے لیے کربلا گئی تھی، جہاں اس کی ملاقات رشتی سے ہوئی، وہ اس کی دعوت وتحریک سے متاثر ہوئی تھی، رشتی کے مرنے کے بعد وہ شیراز میں بابی تحریک سے وابستہ ہوگئی اور اعلان کیا کہ: باب کے ظہور کے سبب احسائی اور رشتی کی کتابیں بھی منسوخ ہوگئی ہیں، نتیجے میں خود اس کے پیروکار اس سے ناراض ہوگئے اور وہ بغداد چلی گئی، جہاں اس نے شریعت اسلامیہ کی تجدید کی ضرورت

---

[1] دیکھئے: المذاھب والافکار المعاصرۃ، ۳۰۳-۳۰۵۔

اور قرآن کے بجائے "البیان" پر اعتماد کرنے کی اپنی دعوت کا نئے سرے سے آغاز کیا، بغداد کے ترکی حاکم نے اسے شہر چھوڑنے کا حکم دیا، وہاں سے وہ ایک بڑے قافلے کو لے کر کرمن شاہ پہونچی جہاں کے حاکم نے بھی اسے شہر بدر کر دیا چنانچہ وہاں سے وہ اپنی جائے پیدائش قزوین چلی گئی، حاکم شہر نے اسے قید کر دیا مگر وہ اپنے ایک پیرو کار مرزا حسین "بہا" کی وساطت سے قید خانے سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئی، اس نے قرۃ العین کو طہران میں واقع اپنے گھر میں چھپا لیا۔

ادھر والی شیراز نے علی محمد باب کے صریح کفر کے ثبوت کے بعد اسے قید کر دیا تھا اور شاہ ناصر الدین نے شیرازی کے دعوائے نبوت، انکار بعثت، عقیدۂ تناسخ اور شریعت اسلامیہ کی منسوخی جیسے اقوال کے ثابت ہونے کی بنیاد پر اس کے قتل کا حکم جاری کر دیا تھا، دوسری طرف ۱۸۴۸ء میں بدشت کے مقام پر بابیوں نے ایک اجتماع کیا تاکہ باب کو بچانے کے لیے کوئی لائحہ عمل تیار کیا جاسکے اور شریعت اسلامیہ کی تنسیخ کے تعلق سے کسی موقف کو متعین کیا جاسکے، اچانک اس اجتماع میں قرۃ العین پہنچ گئی، اس نے پہلی بار اپنے خوبصورت چہرے کو بے نقاب کر رکھا تھا، وہ اپنے بہترین لباس اور انتہائی زیب و زینت میں تھی، وہاں پہونچ کر اس نے بلند آواز میں اعلان کیا کہ:

"وہ صاحب خطاب ہے حاضرین میں سے ہر شخص کھڑا ہوکر اپنے ساتھی کا بوسہ لے اور بیشک باب کے آنے کے بعد شریعت اسلامیہ منسوخ ہوگئی ہے"۔

بیشتر حاضرین نے ناگواری محسوس کی اور کچھ نے اسے قتل کرنے کی بھی کوشش کی مگر اس کے ساتھی حالات پر قابو پانے اور مرکزی قیادت پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگئے، اس نے مکمل طور سے اور کھل کر اسلام کی مخالفت کرنے کا راستہ اختیار کیا۔

۸ جولائی ۱۸۵۰ء کو صبح میں "ماکو" کے قلعہ میں قید باب کو پھانسی دے دی گئی، بابیوں نے اس کی لاش کو تحریک کے نئے مرکز "عکا" میں لاکر دفن کیا۔

قرۃ العین ۳۰ اگست ۱۸۵۲ء کو بغداد کے اپنے تیس[۳۰] جانباز پیرو کاروں کو لے کر خاموشی سے طہران میں داخل ہوئی تاکہ شاہ ناصر الدین کو قتل کر کے باب کی موت کا بدلہ لے سکے مگر اس کی یہ کوشش ناکام رہی اور اس کو اس کے تمام ساتھیوں کے ساتھ پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔

جب قرۃ العین جلاد کے سامنے کھڑی ہوئی تو اسے اپنی دعوت کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی اور تحفے میں اسے اپنا ریشمی رومال پیش کیا مگر جلاد نے اسی رومال سے اسکا گلا گھونٹ دیا اور اس طرح بابی تحریک کا خاتمہ ہوگیا اور اس کی جگہ ایک نئی تحریک قائم ہوئی جسے بہائی تحریک کے نام سے جانا جاتا ہے[۱]

۲۔ بہائیت اس کی بنیاد مرزا حسین علی نوری مولود ۱۸۳۳ء نے ڈالی تھی، مرزا حسین قرۃ العین کے پیرو کاروں میں تھا، اسی نے قرۃ العین کو قید خانے سے نکال کر طہران میں اپنے گھر میں چھپایا تھا، شاہ ایران نے اسے اس کے تبعین کے ساتھ ملک بدر کر دیا تھا، وہ بغداد چلا گیا اور وہاں اپنی سرگرمی شروع کر دی اور "سلیمانیہ" اور کردوں کے علاقوں میں چکر لگانے لگا وہ اپنے بارے میں یہ کہتا کہ وہ نیا باب ہے جس کے بارے میں سابق باب نے بشارت دی ہے، اس نے عوام میں اپنے بہت سے حامی و مددگار بنا لیے، والی بغداد نے اس کو "آستانہ" کی طرف بھگا دیا، جہاں تحریک کی قیادت کے موضوع پر اس کا اپنے بھائی سے اختلاف ہوگیا مگر اس میں اسے کامیابی ملی، آستانہ سے وہ "عکا" چلا گیا اور اسے اپنی

[۱] المذاهب والافکار المعاصرۃ، ۳۰۶ اور مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: البابیۃ عرض ونقد، ۲۳۔

مستقل قیام گاہ بنالیا۔

مرزا حسین نے پہلے یہ دعویٰ کیا کہ وہ باب ہے، پھر یہ کہ وہ مہدی منتظر ہے، پھر خاص نبوت کی بات کی اور پھر عام نبوت کا دعویٰ کر بیٹھا اور کہنے لگا کہ وہ ساری انسانیت کے لیے نبی ہے اور اپنی آخری عمر میں نظریہ حلول کی بنیاد پر خدائی کا دعویٰ کر دیا اور کہنے لگا کہ خدا اس کے اندر حلول کر گیا ہے (معاذ اللہ) وہ بازاروں میں اپنے چہرے کو نقاب سے ڈھنک کر نکلتا تھا، تاکہ کوئی مخلوق خدا کی دلکشی (بہا) کا نظارہ نہ کر سکے اور اپنے آپ کو "بہا" کے لقب سے ملقب کیا، اسی سبب اس کی تحریک بہائی تحریک کے نام سے معروف ہوئی۔

مرزا حسین (بہاء اللہ) نے بہت سی کتابیں بھی لکھیں، جیسے کتاب اقدس، کتاب ایقان، کتاب اشراقات وتجلیات اور کلمات فردوسیہ وغیرہ، مئی ۱۸۹۲ء میں اللہ تعالیٰ نے اسے ہلاک فرمایا۔ فلسطین میں کرمل پہاڑ کے دامن میں اسے دفن کیا گیا اور اس کے مقبرے کا نام بیت البہجت رکھا گیا۔[1]

بعض علمی دستاویزات کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ بہائی تحریک اور صہیونیت ومغربی استعمار کے درمیان گہرے تعلقات ہیں جس کا ایک بین ثبوت فلسطین میں یہودی آبادکاری کو بہاء اللہ کے بیٹے اور خلیفہ عبد البہاء کی صریح تائید ہے، کتاب "مفاوضات عبد البہا" صفحہ نمبر ۹ پر مذکور ہے کہ: "اس امتیازی عہد میں اور اس (مبارک دور) میں بنو اسرائیل ارض مقدس میں مجتمع ہوں گے اور یہودی امت جو مشرق ومغرب اور شمال وجنوب میں منتشر ہو گئی ہے، اکٹھا ہو گی اور فلسطین

[1] المذاہب والافکار المعاصرۃ، ۳۰۷۔

اس کا وطن ہوگا" ۱۹۶۸ء میں مقبوضہ بیت المقدس میں عالمی بہائی کانفرنس منعقد ہوئی جس کی میزبانی یہودیوں نے کی تھی، اس کانفرنس میں پیش کیے جانے والے مقالات سے صہیونی۔ بہائی تحریکوں کے باہمی ربط وتعلق پر روشنی پڑتی ہے، کانفرنس کے اختتامی جشن میں اعلان کیا گیا کہ: "یہودیت اور بہائیت ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں اور بیشتر موضوعات پر آپس میں ہم خیال اور متفق ہیں"۔

یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ عرب ملکوں میں بہائی انجمنیں اسرائیل کے لیے جاسوسی کرتی ہیں، ۱۹۶۰ء میں اس بات کے مکمل ثبوت فراہم ہونے کے بعد مصری حکومت نے بہائی تنظیموں اور انجمنوں پر پابندی لگادی تھی، اسی سے ملتا جلتا واقعہ عراق میں بھی پیش آیا مگر اس کے باوجود بھی اس تحریک کی خفیہ سرگرمیاں آج بھی جاری ہیں۔

پہلی جنگ عظیم میں بہائیوں کی صہیونی اصلیت اس وقت ظاہر ہوگئی تھی جب انہوں نے برطانوی فوج کے "حیفا" میں داخل ہونے پر فاتحین کی حیثیت سے اس کا استقبال کیا تھا، اسرائیل میں آج بھی بہائیوں کے ساتھ یہودیوں ہی جیسا سلوک کیا جاتا ہے اور صہیونی تحریک اور فری میسن کے دباؤ میں ہی اقوام متحدہ نے بہائیت کو عالمی مذہب کا درجہ دیا ہے۔[1]

[1] بہائیت اور فری میسن تحریک ایک ہی سکے کے دو مختلف رخ ہیں، دونوں ہی عالمی بھائی چارے اور انسانی فلاح وبہبود کی علمبردار ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں، دونوں ہی اباحیت اور لامحدود آزادی کی حامی ہیں اور دونوں تحریک کا آغاز ۱۸۴۴ء سے ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔

تفصیل کے لیے دیکھئے: خطر الماسونیۃ القادم، محمد السید علی بلاسی، "اخبار العالم الاسلامی" عدد ۹۴۳، ص/۹۔

اسرائیل کے بائیکاٹ کرنے سے متعلق کمیٹی نے صہیونیت سے تعلقات کی بنیاد پر بہائی تحریک کا نام بھی بلیک لسٹ میں رکھا ہے اور تنظیمات اسلامی کانفرنس نے اتفاق سے یہ قرارداد منظور کی تھی کہ بہائی تحریک ایک غیر اسلامی صہیونی تحریک ہے، یہ کانفرنس ۱۹۹۳ء میں مکہ مکرمہ میں رابطۂ عالم اسلامی کی دعوت پر منعقد ہوئی تھی اور اس میں ۵۰ سے زیادہ اسلامی تنظیمات اور اداروں نے شرکت کی تھی [1]۔

۴۔ قادیانیت اس کی بنیاد مرزا غلام احمد نے ڈالی جو ۱۸۳۰ء میں پاکستانی پنجاب کے ایک گاؤں "قادیان" میں پیدا ہوا، قادیانیوں نے اپنے موسس کی جائے پیدائش کو "ربوۃ" کا نام دیا تاکہ یہ آیت کریمہ ان پر صادق آجائے:

وَآوَیْنَاهُمَا إِلَىٰ رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ۔ (المومنون ۲۳: ۵۰)

اور ہم نے عیسیٰ اور ان کی ماں کو ٹھکانا دیا ایک ٹیلہ پر جہاں ٹھہرنے کا موقع تھا اور پانی نتھرا۔

غلام احمد کی پیدائش و پرورش ایک ایسے گھرانے میں ہوئی جو برطانوی استعمار کا ایجنٹ تھا، اس کا باپ ان غداروں میں سے ایک تھا جنھوں نے مسلمانوں سے خیانت کی اور ان کے خلاف سازشیں کیں اور عزت وجاہ کی طلب میں استعمار کے ساتھ تعاون کیا، اس کا ذکر خود غلام احمد قادیانی نے "تحفۂ قیصریہ" ص ۱۶ میں کیا ہے "میرے والد غلام مرتضی اور انگریزی حکومت کے درمیان بے حد خوشگوار روابط اور دوستانہ تعلقات تھے، دربار حکومت میں ان کا مخصوص مقام تھا، ۱۸۵۷ء میں جب ان کے ہم وطن اور ہم مذہب لوگوں نے حکومت کے خلاف بغاوت کی تھی تو انھوں نے حکومت کی بہت

[1] المذاہب والافکار المعاصرہ، ۳۰۷، ۳۰۹۔

مدد کی تھی ...."

غلام احمد نے غیر معروف اساتذہ سے اردو اور عربی کی چند کتابیں پڑھیں اور قانون کی تھوڑی تعلیم حاصل کی اور سیالکوٹ میں ۱۵ روپے ماہوار کی ملازمت کی [1]

۱۹۰۰ء میں اس نے اپنی دعوت کا باضابطہ آغاز کیا اور دعویٰ کیا کہ وہ نبی مرسل ہے اور اس کی رسالت کا منکر کافر ہے، نہ اس کا ذبیحہ کھایا جائے گا اور نہ اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور نہ ہی اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا، جب اس کے ایک بیٹے کا انتقال ہوا جو اس کے بیٹے کا منکر تھا تو مرزا اور اس کے پیروکاروں نے اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی، ... غلام احمد نے "براہین احمدیہ" نامی ایک کتاب لکھی جس کا ایک حصہ ۱۸۸۰ء میں شایع ہوا، اس میں اس نے اپنے مہدی منتظر ہونے کا دعویٰ کیا [2]۔

قادیانیت اپنے آغاز کے فوراً بعد ہی دو فرقوں میں تقسیم ہوگئی: ایک فرقہ "احمدیہ" یا لاہوری جماعت کے نام سے معروف ہوا جسے بعض حضرات پوشیدہ قادیانیت کا نام دیتے ہیں، اس فرقے کی قیادت خواجہ کمال الدین اور مولانا محمد علی وغیرہ نے کی، ایشیا، افریقہ اور یورپ میں اس کی سرگرمیاں بے حد وسیع ہیں۔

۱۹۲۰ء میں محمد علی نے قرآن پاک کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور ۱۹۲۶ء میں "اسلام" نام کی اپنی کتاب لکھی، اس فرقے کے پانچ ہزار سے زیادہ داعی صرف براعظم افریقہ میں اپنے فکر وعقیدے کی نشر واشاعت میں مصروف ہیں، اس فرقے کا اپنا انسائیکلوپیڈیا ہے اور عربی وانگریزی کی سیکڑوں کتابیں ہیں جو اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ اس کو غیر معمولی خارجی امداد وتعاون حاصل ہے۔

[1] المذاہب والافکار المعاصرہ، ۳۱۱ [2] نفس مرجع، نفس صفحہ

دوسرا فرقہ قادیانی کہلاتا ہے، جس کی قیادت خود مرزا نے کی تھی، اس کے بعد اس کے خلیفہ نور الدین نے اور پھر مرزا کے بیٹے اور اس کے دوسرے خلیفہ بشیر الدین محمود نے کی۔

احمدی اور قادیانی فرقوں میں فرق یہ ہے کہ قادیانی مرزا غلام احمد کی نبوت پر یقین رکھتے ہیں جبکہ احمدی جماعت کا دعویٰ ہے کہ وہ انہیں صرف ایک دینی مصلح کی حیثیت سے دیکھتی ہے[1]

حقیقت میں دونوں جماعتیں ایک ہی تحریک کے دو مختلف پہلو ہیں اور ایک دوسرے کی متمم ہیں، مگر ان میں احمدی کہلانے والا فرقہ اسلامی عقیدے کے خلاف سب سے خطرناک تخریبی تحریک ہے، کیونکہ یہ تحریک کتاب و سنت کی طرف دعوت کے اپنے نعروں اور قرآن کے ترجمہ وغیرہ کے ذریعے اپنی حقیقت کو چھپانے اور اسلامی سوسائٹی میں بہت سے اہم مقامات پر قبضہ کرنے میں کامیاب رہی ہے .....

قادیانیت: برطانوی استعمار کی ایجنٹ برطانوی استعمار نے اسلام سے مقابلے کے لیے ایک اسکیم کے مطابق، تمام دنیا کے مسلم ممالک میں ایجنٹوں کی تلاش شروع کی، دنیا کی کوئی قوم غداروں اور خائنوں سے خالی نہیں ہوئی مگر ہندوستان میں انگریزوں کو ملنے والی ایجنٹ غلام احمد سب سے خطرناک تھا کیونکہ یہ تجدید دین اور مہدویت کے نقاب میں ظاہر ہوا... پھر دعویٰ کیا کہ اس پر وحی نازل ہوتی ہے لیکن وہ مستقل نبی نہیں ہے، بلکہ تابع نبی ہے جیسا کہ حضرت ہارون حضرت موسیٰ کے تابع تھے۔ اس طرح اس نے مسلمانوں کی صف میں رہ کر استعمار کی وہ جلیل القدر خدمت انجام دی جو وہ دائرہ اسلام سے نکل کر نہیں کر سکتا تھا، برطانوی حکومت کے لیے اس کی سب سے بڑی خدمت اس کا یہ

[1] المذاہب والافکار المعاصرۃ ص ۳۱۴، ۳۱۵۔ معمولی ردوبدل کے ساتھ۔

فتویٰ ہے کہ انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کو ہتھیار اٹھانے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ حکم جہاد ختم ہو گیا ہے اور چونکہ انگریز زمین پر خدا کے خلیفہ ہیں لہذا ان کے خلاف بغاوت جائز نہیں۔

مرزا غلام احمد اپنی کتاب "شہادۃ القرآن" میں کہتا ہے کہ:

"انگریزی حکومت کی تائید و حمایت میں میں نے اپنی عمر صرف کر دی اور جہاد کے ممنوع ہونے اور انگریز صاحبان امر کی اطاعت کے واجب ہونے کے بارے میں اتنی کتابیں اور رسائل لکھ چکا ہوں کہ اگر سب کو جمع کیا جائے تو پچاس صندوق بھر جائیں....." (صفحہ)

نو آبادکار اس کی ان خدمات سے بے حد خوش ہوئے اور مال و دولت اور حفاظت و حمایت کے ساتھ اس کی مدد کی چنانچہ ایک ایسا شخص جس نے زندگی میں کبھی سو روپے نہ دیکھے ہوں لاکھوں میں کھیلنے لگا اور پندرہ روپے ماہانہ کی معمولی سی نوکری کرنے والا اور طلب معاش میں شہر شہر اور گاؤں گاؤں پھرنے والا عالی شان محل تعمیر کرنے لگا، یہ سب برطانوی استعمار کی دین تھی، جس کا اعتراف خود غلام احمد نے اس یادداشت (میمورنڈم) میں کیا ہے جسے اس نے ملکہ برطانیہ کی ہندوستان آمد پر ان کو پیش کیا تھا، اس احسان مندی کا ذکر "ملفوظات احمدیہ" نامی کتاب میں بھی ہے، مرزا غلام احمد برطانوی حکومت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ: "اس حکومت کے ہمارے اوپر غیر معمولی احسانات ہیں....."

مئی ۱۹۰۸ء میں غلام احمد ہیضہ کے مرض میں گرفتار ہو کر مر گیا، اس کے خلیفہ حکیم نور الدین نے اس کے نقش قدم کی پیروی کرتے ہوئے انگریزوں سے دوستی برقرار رکھی، انگریز آقاؤں نے یورپ اور افریقہ وغیرہ میں مختلف ذرائع سے اس کی مدد کی۔

۷ نومبر ۱۹۱۸ء کو اخبار "الفضل" میں مرزا کے لڑکے بشیر الدین کا ایک بیان شائع ہوا ہے، وہ کہتا ہے کہ:

"انگریزوں کے مشرق وسطیٰ میں داخلے پر ہم کیوں نہ خوش ہوں، ہمارے امام غلام احمد نے فرمایا ہے کہ: میں مہدی منتظر ہوں اور برطانوی حکومت ہماری تلوار ہے، ہمیں اس فتح سے بے حد مسرت ہے اور اس تلوار کی چمک و دمک کو ہم شام و عراق اور ہر جگہ دیکھنا چاہتے ہیں۔"

قادیانی۔ یہودی تعلقات اسرائیل کے وجود سے بھی پہلے احمدی قادیانیوں نے "یافا" شہر میں اپنا مرکز قائم کیا تھا تاکہ انہیں انگریزی حمایت حاصل رہے اور جیسے ہی اسرائیلی حکومت قائم ہوئی انگریزوں نے ان قادیانیوں کو برطانوی پاسپورٹ جاری کر دیے اور حکومت اسرائیل نے بھی انہیں احمدیت کی تبلیغ و اشاعت کی پوری آزادی دیدی۔

ایک عرب قادیانی محمد خیر قادری اپنی کتاب "القادیانیۃ" میں لکھا ہے کہ:

"اسرائیل کے حیفا شہر کے جبل کرمل نامی علاقے میں احمدی تبلیغی مرکز قائم ہے جس میں مسجد، کتب خانہ، مدرسہ اور ایک اشاعتی مرکز ہے، مرکز سے "بشریٰ" نام سے ایک ماہنامہ بھی نکلتا ہے، جو عرب ملکوں میں تقسیم ہوتا ہے، اس مرکز سے مسیح موعود کی بہت سی تعلیمات کو عربی میں منتقل کیا ہے، کچھ عرصہ قبل ہمارے ایک بشر نے بلدیہ حیفا کے چیرمین سے ملاقات کی اور ان کے ساتھ بہت سے موضوعات پر گفتگو کی۔ جن میں جبل کبابیر کے پاس ایک مدرسے کا قیام بھی ہے (بعد میں) چیرمین صاحب اور چار اہم شخصیات نے مرکز تشریف لاکر ہماری عزت افزائی کی، ہماری جماعت نے ان کا استقبال کیا اور ان کے اعزاز میں ایک پروگرام کا انعقاد کیا۔ جب ہمارے مبشر نے پاکستان واپسی کا ارادہ کیا تو اسرائیل کے صدر نے خط بھیج کر پاکستان واپسی سے قبل ان سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔"

آج بھی حکومت اسرائیل کی حمایت و حوصلہ افزائی کے سائے میں احمدی جماعت سرگرم عمل ہے۔[1]

قادیانی عقاید وافکار ۱۔ دعوئے نبوت۔ مرزا "حقیقۃ الوحی" ص/۲۴ کے حاشیے میں لکھتا ہے کہ: "میں تمام انبیاء و مرسلین سے افضل ہوں" اور ص/۱۶۳ پر ہے کہ "جو مجھ پر ایمان نہیں رکھتا وہ اللہ اور رسول پر ایمان نہیں رکھتا۔"[2]

۲۔ آیت کریمہ (... خاتم النبین) کے معنی میں تحریف کر کے اسے مہر اور زینت انبیاء کے معنی میں کر دیا۔ مرزا بشیرالدین کی کتاب "حقیقۃ النبوۃ" ص/۲۸۸ پر ہے:

"یہ بات آفتاب نیمروز کی طرح واضح ہے کہ باب نبوت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی کھلا ہے۔"[3]

۳۔ مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا اور بخاری و مسلم اور حدیث کی دوسری بہت سی کتابوں میں نزول مسیح سے متعلق احادیث کو غلام احمد نے ذات پر چسپاں قرار دیتا ہے۔

اپنے مجموعۂ بیانات" ۱۰ : ۱۸ میں کہتا ہے کہ: "خدا کی قسم جس نے مجھے بھیجا ہے اور جس کی ذات پر کسی لعنتی کے سوا کوئی بھی افترا نہیں کر سکتا، میں مسیح موعود بنا کر بھیجا گیا ہوں" "تحفۂ گولڑۃ" ص/۱۹۵ میں لکھتا ہے کہ: میں وہی مسیح موعود ہوں آخری زمانے میں جسکے ظہور کی خبر تمام آسمانی کتابوں نے دی ہے۔

۴۔ حضرت عیسیٰ کے بارے میں ان کا عقیدہ ہے کہ وہ اپنی قبر سے زندہ ہو کر اٹھے اور کشمیر ہجرت کر گئے جہاں ۱۲۰ سال کی عمر میں انکا انتقال ہوا۔

---

[1] القادیانیۃ، دراسات وتحلیل، احسان الٰہی ظہیر، لاہور: ادارۂ ترجمان السنۃ، بار سیزدہم، ۱۹۸۳ء، ۴۵ [2] مرجع سابق، ۳۱۲ [3] ایضاً۔

اپنی کتاب "براہین احمدیہ" میں مرزا نے انگریزی میں الہام ہونے کا دعویٰ کیا، صفحہ ۴۸۰ پر لکھتا ہے کہ: "کئی بار مجھے انگریزی میں الہام ہوا اور لہجے سے مجھے ایسا لگا جیسے کوئی انگریز میرے سر پر کھڑا بول رہا ہے"۔

۵۔ قرآن کے مقابلے میں ایک کتاب تیار کی جس کا نام "الکتاب المبین" رکھا، مرزا کا خلیفہ اخبار "الفضل" کے ۱۵ جولائی ۱۹۲۴ء کے شمارے میں لکھتا ہے کہ: "مسیح موعود کے پیش کردہ قرآن کے سوا کوئی قرآن نہیں ہے۔

۶۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں اپنے عقیدے کا اظہار کرتے ہوئے اپنی کتاب "بشریٰ ۲: ۷۹ میں مرزا لکھتا ہے کہ: "اللہ تعالیٰ نے مجھ سے کہا کہ میں رسول کے ساتھ محیط ہوں ہیں رسول کے ساتھ جواب دیتا ہوں جو کبھی صحیح ہوتا ہے کبھی غلط ... میں روزہ رکھتا ہوں، نماز پڑھتا ہوں، سوتا اور جاگتا ہوں ..."

۷۔ جہاد فی سبیل اللہ کی منسوخی کا عقیدہ۔ اپنے مجموعۂ بیانات " ۴: ۴۹ میں لکھتا ہے کہ: "اب جہاد کی فکر ترک کر دو، دین کے لیے جہاد کرنا اب حرام ہے ... اب جہاد باقی نہیں رہا بلکہ جو جہاد فی سبیل اللہ کرے گا وہ اللہ کا دشمن ہوگا ..."

انھیں افکار و عقاید کی بنیاد پر علمائے مسلمین نے اجتماعی طور پر اس فرقے کو اسلام سے خارج قرار دیا اور یہ فیصلہ ۱۹۵۳ء میں کراچی میں منعقد ایک کانفرنس میں کیا گیا جس میں مشرقی اور مغربی پاکستان کی تمام اسلامی جماعتوں کے نمائندوں اور منتخب علمائے کرام نے شرکت کی اور قانون ساز اسمبلی میں ایک سفارش پیش کرتے ہوئے یہ مطالبہ کیا کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے اور صوبۂ پنجاب سے انکے لیے اسمبلی کی ایک سیٹ مخصوص کر دی جائے، پاکستان میں منعقد تنظیم اسلامی کانفرنس

نے بھی اپنے فیصلے میں قادیانیت کو غیر اسلامی تحریک قرار دیا، اس طرح رابطۂ عالم اسلامی کی دعوت پر دنیا بھر کی اسلامی تنظیموں کی نمائندہ کانفرنس ۱۳۹۳ھ کو منعقد ہوئی اور جس میں ۱۴۴ اسلامی تنظیمات کے مندوبین شریک ہوئے، اس کانفرنس نے اجتماعی طور پر قادیانیوں کی تکفیر کا حکم جاری کیا، یہ فیصلہ تمام امت کا فیصلہ تھا اور ان قراردادوں کے سلسلے کی آخری کڑی، پاکستان پارلیمنٹ کا وہ فیصلہ تھا جس کے مطابق قادیانی فرقے کے لوگوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا[۱]

۵۔ باطنیت[۲] باطنی مذہب کی بنیاد ایسے لوگوں نے ڈالی جو اسلام اور رسول اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اپنے دلوں میں شدید بغض و نفرت رکھتے تھے، ان میں فلاسفہ ملحدین، مجوسی اور یہودی وغیرہ شامل تھے تاکہ اسلام کو طاقتور نہ ہونے دیں اور اسے کمزور کر سکیں اور لوگوں کو اس سے دور کر سکیں اور اپنی کھوئی ہوئی قوت و حکمرانی کو پا سکیں اور مذہب اسلام کا خاتمہ کر سکیں، لیکن ... یَابیَ اللّٰہ اِلا ان یتم نورہ ...؛

کہا جاتا ہے کہ اس ناپاک تحریک کا آغاز ۹۷۱ھ میں میمون بن قداح کے کوفے میں ظہور سے ہوا جس نے مسلمانوں کے لیے یہ جال بچھایا اور حق و باطل کو خلط ملط کرنے کی کوشش کی، قرآن کی ہر آیت کی نئی تفسیر کی اور احادیث کی طرح طرح سے تاویلات کی، وہ کہتا تھا کہ تمام فرائض و سنن صرف رموز و اشارات ہیں، ان کا ظاہر صرف چھلکا ہے

---

[۱] تفصیل کے لیے دیکھیے: القادیانیۃ المستترۃ، اخطر الحرکات الھدامۃ علی عقیدۃ المسلمین شیخ علی عیسیٰ، "الاخبار العالم الاسلامی" عدد ۱۱۸۸، ص/۱۰
[۲] اس گمراہ اور بدمذہب فرقے کے سلسلے میں دیکھیے: "بیان مذہب الباطنیہ وبطلانہ" منقول از کتاب "قواعد عقائد آل محمد" تصنیف محمد بن الحسن دیلمی، تصحیح و تحقیق: رشد و طان، لاہور: ادارۂ ترجمان السنہ، بار دوم، ۱۹۸۲ء۔

اوران کا مغز ان کے باطن میں پوشیدہ ہے، یہ شخص اصلاً یہودی تھا اور خود کو مسلمان ظاہر کرتا تھا، اس کا مقصد اسلام کو ڈھا دینا تھا جیسا کہ یہودی عام طور پر دشمنِ اسلام ہوتے ہیں۔

اس مذہب کے دس مختلف القاب ہیں: اسماعیلیہ، باطنیہ، قرامطہ، سبعیہ، خرمیہ، بابکیہ، محمرۃ، تعلیمیہ، قرمطیہ اور خرمدینیہ۔

باطنی مذہب کا مقصد مسلمانوں کو ورغلانا اور انہیں ان کے سچے مذہب سے دور رکھنا تھا مگر یہ بات ممکن نہ تھی کہ مسلم حکومتوں میں رہکر صراحت کے ساتھ اس کا اعلان کریں چنانچہ اس کے لیے انہوں نے کچھ حیلے تیار کیے تاکہ لوگوں کو اپنے افکار و مقاصد سے مطلع کرسکیں، یہ حیلے مرحلہ وار ایک کے بعد ایک نو عدد ہیں: رزق[1]، فکر[2]، موانسہ[3]، تشکیک[4]، تعلیق[5]، ربط[6]، تدلیس[7]، تاسیس[8]، خلع[9]، اور مسخ اور ان حیلوں کا نام "بلاغ اکبر" رکھا جو زیادہ تر فلسفیانہ افکار پر مشتمل ہیں۔

یہ لوگ دو ازلی خداؤں کے قائل ہیں، جن کے وجود کا کوئی آغاز نہیں ہے اور یہ دونوں عقل و نفس، یا علت و معلول، یا سابق و لاحق، یا لوح و قلم، یا مفید و مستفید ہیں، بقول ان کے باری تعالیٰ کو نہ تو وجود کے ساتھ متصف کیا جا سکتا ہے اور نہ عدم کے ساتھ، نہ وہ معلوم ہے نہ مجہول، نہ موصوف ہے نہ غیر موصوف، نہ قادر ہے نہ غیر قادر اور نہ عالم ہے نہ غیر عالم، یہ لوگ طبیعت اور ستاروں کی تاثیر کے قائل بھی ہیں، مختصر یہ کہ ان کا مقصد خالق سبحانہ و تعالیٰ کا انکار ہے مگر اتنی صفائی کے ساتھ کہ خلق پر ظاہر نہ ہو سکے۔

نبوت کے سلسلے میں اس مذہب کا نظریہ عام فلسفیوں جیسا ہے، وحی الٰہی،

نزول ملائکہ اور معجزات کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ سب رموز و اشارات ہیں اور ایسی مثالیں ہیں جنھیں اہل نظر نہیں جانتے، حضرت موسیٰ کے اژدھے کا مطلب آل فرعون پر ان کا غلبہ ہے، اظلال غمام یعنی بادلوں کے سایہ فگن ہونے کا معنی بنو اسرائیل پر حضرت موسیٰؑ کی سیادت و قیادت ہے، ان لوگوں نے حضرت عیسیٰؑ کے بغیر باپ ہونے کا بھی انکار کیا، ان کے نزدیک ان کے بنا باپ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے کسی امام سے علم حاصل نہیں کیا، بلکہ نائب امام سے حاصل کیا۔ قرآن کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ: "إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ" انگلیوں سے پانی جاری ہونے کی تاویل یہ کی ہے کہ اس سے مراد کثرت علم ہے اور مغرب سے سورج نکلنے کا مطلب امام کا ظاہر ہونا ہے۔

فرقہ اسماعیلیہ کے ایک امام محمد بن اسمٰعیل کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ نبی ہیں اور شریعت محمدیہ کو منسوخ کرنے والے ہیں، بلکہ ان میں سے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ محمد بن اسماعیل زندہ ہیں اور اس وقت تک نہیں مریں گے جب تک زمین کو عدل سے معمور نہ کر دیں۔

اس فرقے کا حال یہاں تک پہونچا کہ وہ اپنے اماموں کو خدا کہنے لگے۔ معاذاللہ اور اس کے علاوہ بھی بہت سے امور ہیں جو ان کے کفر اور خروج پر صراحت سے دلالت کرتے ہیں، اگرچہ یہ لوگ زبردستی اپنے کو اسلام کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔

نبوت کے دعوے لگاتار چلے آرہے ہیں، سوڈان میں محمد محمود طاہر نے

نبوت کا دعویٰ کیا اور "الاخوان الجمہوریین" کے نام سے ایک جماعت بنائی مگر یہ تحریک کچل دی گئی، امریکہ میں رشاد خلیفہ نامی ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا مگر چند ماہ قبل اسے بھی قتل کر دیا گیا، ان کے علاوہ بھی بہتوں نے دعوئے نبوت کیا، اس میں کوئی تعجب نہیں بلکہ یہ ہمارے رسول کی نبوت کے دلائل میں سے ایک دلیل ہے کہ آپ کو ایسے علم غیب سے باخبر کیا گیا ہے جس کا علم اللہ علیم و خبیر کے سوا کسی کو بھی نہیں ہے۔ ابن اسحٰق حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"اس وقت تک قیامت قایم نہ ہوگی جب تک تیس دجال ظاہر نہ ہوں اور یہ سب کے سب نبوت کا دعویٰ کریں گے"[1] صلی اللہ تعالیٰ علیٰ سیدنا محمد خاتم الانبیاء والمرسلین والذی لا نبی بعدہ وسلم تسلیما کثیرا، والحمد للہ رب العالمین۔

---

[1] دیکھیے سیرۃ ابن ہشام، ۴: ۲۴۴۔

الکلام

علامہ شبلی نعمانیؒ

اس نہایت اہم کتاب میں اسلام کے عقائد خصوصاً وجود باری تعالیٰ، نبوت و رسالت پر فلسفۂ حال کے مقابلہ میں پُرزور بحث کی گئی ہے اور منکرین خدا، توحید خرق عادت اور نبوت کی حقیقت، غیر محسوسات اور وحی و الہام جیسے موضوعات پر بحث کے بعد ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام تمدن اور ترقی کا مانع نہیں بلکہ موید ہے، آخر میں امام رازی کی ایک اہم تقریر کا خلاصہ لکھا ہے۔

قیمت ۵۰ روپے

دستاویز

بہار قانون ساز کاؤنسل کی کارروائیوں کی اردو رپورٹ

از جناب عبدالمنان ہلالی

گزشتہ کئی برسوں سے مسٹر لالو پرشاد یادو بہار کے وزیر اعلیٰ ہیں[1]۔ گو ان کے پیش رو جناب جگن ناتھ مصرا کے زمانے ہی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ مل چکا تھا لیکن اس میں شبہ نہیں کہ مسٹر یادو کے دور میں اردو کا فروغ زیادہ ہو رہا ہے، خصوصاً جب سے پروفیسر جابر حسین بہار قانون ساز کونسل کے چیرمین مقرر ہوئے ہیں، اس وقت سے اردو کے لیے متعدد عملی اقدامات کیے جا رہے ہیں، انہوں نے کونسل کی کارروائی سے متعلق اردو میں دستاویز کے نام سے تین کتابیں شایع کی ہیں، اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے جناب عبدالمنان ہلالی جوائنٹ سکریٹری دارالمصنفین نے تینوں دستاویزوں کے مشمولات کا جائزہ و تعارف کرایا ہے تاکہ بہار قانون ساز کونسل میں اردو کے تعلق سے ہونے والی کارروائی اور دیگر سرگرمیوں کا اندازہ ہو۔ "ض"

پروفیسر جابر حسین چیرمین بہار قانون ساز کاؤنسل نے کاؤنسل کی کارروائیوں سے متعلق اردو میں دستاویز کے نام سے تین کتابیں شایع کی ہیں۔

پہلی کتاب میں بہار کی دوسری سرکاری زبان اردو کو قانون ساز کونسل کی آئینی زبان بنانے کی کارروائی، کاؤنسل میں اردو شعبے کا قیام، اس کے عہدوں کی تشکیل، ہندی کے ساتھ اردو زبان و رسم الخط میں بہار گزٹ کی اشاعت، اردو ڈائرکٹریٹ کے قیام سے متعلق ہوئی نشست کی رپورٹ، دو صد سالہ تقریبات غالب وغیرہ کا ذکر ہے۔

---

[1] ان سطور کی اشاعت کے وقت وہ مستعفی ہو گئے ہیں۔

پروفیسر جابر حسین صاحب نے ۱۰ اپریل ۱۹۹۵ء کو بہار قانون ساز کاؤنسل کے کارگزار چیرمین کی حیثیت سے اپنے عہدے کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ اسی دن انہوں نے کاؤنسل کے ذمہ داروں اور عہدیداروں سے دریافت کیا کہ دوسری سرکاری زبان ہونے کی حیثیت سے اردو کے آئینی حقوق کے لیے کاؤنسل میں اس وقت تک کیا پیش رفت ہوئی۔

اسی نشست میں انہوں نے یہ بھی دریافت کیا کہ تقریباً پانچ دہائیوں سے شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائب طبقوں کے لیے سرکاری اداروں کی سیدھی بحالیوں میں بنائے گئے ریزرویشن قوانین کاؤنسل میں نافذ ہیں یا نہیں؟ ۱۹۷۸ء سے پورے صوبے میں پسماندہ طبقوں کے لیے بھی ایسے ہی ریزرویشن قوانین نافذ ہیں، ان کا اطلاق کاؤنسل کی بحالیوں میں ہوا ہے یا نہیں؟ ۹۳-۱۹۹۲ء سے جن قوانین کا نفاذ شیڈول کاسٹ، شیڈول ٹرائب اور پسماندہ طبقوں کے ریزرویشن کے لیے لازمی قرار دیا گیا ہے، ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے سزا بھی مقرر کی گئی ہے، ان کا عملی نفاذ کاؤنسل میں ہوا کہ نہیں؟

جب سارے ہی سوالات کے جواب نفی میں ملے تو پروفیسر جابر حسین کی ہدایت پر اسی دن متذکرہ نکات کے نفاذ کی جانب ضروری کارروائی مکمل کر لی گئی۔ اور اس طرح ایک آئینی ادارے میں آئینی مراعات و اختیارات سے چشم پوشی اور خلاف ورزی کی یہ دیرینہ روایت اپنے اختتام کو پہنچی۔

اردو بہار کی ثانوی سرکاری زبان تو گزشتہ تقریباً دو دہائیوں سے تھی مگر یہ قانون ساز کاؤنسل کی آئینی زبان نہیں تھی، اسے کاؤنسل کی زبان کا درجہ دینے کے لیے پروفیسر جابر حسین نے ۲۶ دسمبر ۱۹۹۵ء کو ایک نوٹیفیکیشن جاری کیا، اس کے ذریعہ بہار قانون ساز کاؤنسل کے ضابطہ نامہ، طریقہ کار اور دستور العمل کی دفعہ

۲۰۳ (۴) کے تحت دفعہ ۱۰۲ میں ترمیم کا اعلان کیا۔ اسکے تحت اب کاؤنسل کا سارا کام ہندی زبان (دیوناگری رسم الخط) اور اردو زبان و رسم الخط میں انجام پانے لگا۔ دوران اجلاس "روزانہ فہرست امور" "توجہ طلب نوٹس" "روزانہ تفصیلات" وغیرہ ہندی ہی کی طرح اردو میں بھی تیار کر کے اراکین تک وقت سے پہلے پہنچائے جانے لگے۔ ۳۰ اگست ۱۹۹۵ء ایک تاریخی دن تھا جب بہار گزٹ ہندی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی شائع ہوا[۱]۔

"سماجیاتی تقاضوں کا پس منظر اور اردو کی عملی ترجیحات" ایوان کی میز پر رکھی جانے والی ایک رپورٹ ہے، اس میں آنے والے پانچ برسوں کا ایکشن پلان مرتب کیا گیا ہے، اس کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

آڈیو ویژول میڈیا کے ذریعہ اردو۔ سماجی علوم کی کتابیں اردو میں۔ ثانوی سرکاری زبان اردو کے نفاذ کی جہتیں۔ مراسلاتی نظام اردو میں۔ اردو نظام املا کی معیار سازی۔ اردو کتب خانوں کا جال۔ اردو اور روزگار۔ اساتذہ کے لیے تربیتی نظم۔ مردم شماری اور اردو۔ انتخابات اور اردو۔ وغیرہ وغیرہ۔

مذکورہ رپورٹ پر ایوان میں جو مباحثہ ہوا اس میں اردو کے برمحل اشعار کے استعمال نے کارروائی رپورٹ کو ادب پارہ بنا دیا ہے:

لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی

اس مصرعے سے مقرر نے گاگر میں ساغر بھر دیا اور جب یہ شعر پڑھا گیا:

گھروں پہ نام ملے، ساتھ نام کے عہدے ؛ بہت تلاش کیا کوئی آدمی نہ ملا

تو اردو میں خیال کی ایسی جامع اور موثر ادائگی پر شریک مباحثہ خراج تحسین پیش کیے بغیر

[۱] اتر پردیش میں گزٹ اردو میں بہت پہلے چھپتا تھا۔

نہیں رہ سکا۔

پروفیسر جابر حسین صاحب کی دوسری کتاب "دستاویز۔ ۲" ریاست بہار کے تعلیمی اور تدریسی مسائل سے متعلق ہے۔ اس کتاب میں ودیالیہ سیوا بورڈ کے تحت ۲۴۸ اردو اساتذہ کی تقرری سے متعلق التوا میں پڑے معاملے پر پروفیسر جابر حسین صاحب کی صدارت میں متعلقہ محکمہ کے ذمہ دار افسران کی جو نشست ہوئی اس کی رپورٹ، دوران اجلاس اراکین کاؤنسل کے ذریعہ اقلیتی تعلیمی اداروں کے اساتذہ سے متعلق سوالات، ان پر حکومت کا جواب اور چیرمین کی رولنگ شامل ہیں۔

اس میں پرمانند سنگھ مدن و دیگر اراکین کے ذریعہ اقلیتی اسکولوں کے اساتذہ کو پندرہ مہینوں سے تنخواہ کی ادائیگی نہ ہونے سے متعلق سوال وجواب، پروفیسر جابر حسین چیرمین کی رولنگ اور تنخواہ کی ادائیگی سے متعلق ایوان میں کیا گیا اعلان بھی شامل ہیں۔

نیلامبر چودھری کے سوال "یونیورسیٹیوں اور کالجوں میں مستقل اساتذہ نہیں" پر ایوان کی کارروائی، حکومت کا جواب اور چیرمین جابر حسین کی رولنگ، مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی کے قیام سے متعلق جناب شکیل احمد خاں کی توجہ طلب نوٹس اور اس پر چیرمین جابر حسین کی رولنگ جگہ پائے ہوئے ہیں۔ واضح رہے کہ بہار اسٹیٹ یونیورسٹی ایکٹ سنہ ۹۲ء کے تحت بہار میں گیارہ یونیورسٹی قائم کرنے کا نظم کیا گیا، لیکن مولانا مظہر الحق یونیورسٹی کے سوا سب کا قیام عمل میں آچکا ہے۔

مباحثے کی کارروائیوں کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسانی گروپ کا دماغ (بشرطیکہ وہ لوگوں کی بھیڑ نہ ہو) ایک فرد کے دماغ سے بہر حال زیادہ زرخیز

ہوتا ہے، جب کسی مسئلہ پر ایوان میں بحث ہوتی ہے تو موضوع کے بہت سارے پہلو سامنے آجاتے ہیں جو انفرادی سوچ سے نہیں آسکتے۔

پروفیسر جابر حسین تنقید اور نکتہ چینی سے بالکل نہیں گھبراتے بلکہ ان کا استقبال کرتے ہیں مگر نکتہ چینی سے لہولہان ہونے کی ان کی خواہش کچھ عجیب سی لگتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے جو کام کیا ہے وہ اب تک اردو کے کسی اور بہی خواہ سے نہیں ہو سکا، اسکے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

تیسری کتاب "دستاویز۔ ۳" میں روایتی دستکاروں کی مشکلات پر ایوان میں مباحثہ، بہار قانون ساز کاؤنسل کی حقوق انسانی کمیٹی کے دائرہ کار اور طرز عمل سے متعلق عبوری رپورٹ، دیپا مرمو کے ساتھ زنا بالجبر حادثے سے متعلق بہار قانون ساز کاؤنسل کی حقوق انسانی کمیٹی کی جانچ رپورٹ، چیرمین کے آفس چیمبر میں اقلیتوں اور پس ماندہ برادریوں کے لیے ریزرویشن کے نفاذ سے متعلق نشست کی کارروائی۔ آرٹ کلچر، اقلیتی فلاح سے متعلق ایوان کی نشست کی کارروائی، گیا اور چترا ضلع کے اقلیتی فرقہ کے لوگوں کے قتل پر جانچ کمیٹی کی عبوری رپورٹ شامل ہیں۔

دستکاروں کی دشواریوں سے متعلق جو بحث ایوان میں ہوئی اس سے پتہ چلتا ہے کہ جو رقم کھادی بورڈ کو دستکاروں کی ترقی کے لیے ملتی رہی وہ کھادی بورڈ اپنے رکھ رکھاؤ پر خرچ کرتا رہا۔ گوتم ساگر رانا نے کہا اگر دستکاروں اور محنت کشوں کو کام نہیں ملے گا تو وہ اوزار کی جگہ ہتھیار اٹھانا پسند کریں گے۔ انہوں نے یہ کہا کہ ہم مانتے ہیں کہ ہندوستان صنعتی ترقی میں دسویں، اٹامک انرجی میں ساتویں اور خلائی سائنس میں چھٹویں نمبر پر ہے مگر دنیا کی انسانی ترقی میں ۱۷۴ ملکوں میں ہندوستان ۱۳۴ ویں نمبر پر ہے۔ انہوں نے

تاریخ کا حوالہ دیا کہ ۱۷۸۹ء میں پرتگال کے پاس تین سمندری تجارتی جہاز تھے، ہالینڈ کے پاس پانچ، ڈنمارک کے پاس ایک، امریکہ کے پاس پانچ اور ہندوستان کے پاس پچیس تھے۔

بہار میں جہاں آج بھی جاگیردارانہ اور زمیندارانہ نظام کا راج ہے، ان طبقوں کو جنھیں ریزرویشن دیے گئے ہیں ان کو اس کا فائدہ نہیں پہنچ سکا ہے، بلکہ اس میں طرح طرح کی نامناسب رکاوٹیں کھڑی کی گئی ہیں۔ مثلاً میڈیکل کالجوں کے پوسٹ گریجویٹ کلاسوں کے اساتذہ کی تقرری میں ریزرویشن کا اصول نافذ ہے، مگر اساتذہ کی کم سے کم لیاقت پوسٹ گریجویٹ رکھی گئی جس کے داخلے کے لیے ریزرویشن کا نظم نہیں نافذ کیا گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ریزرویشن طبقے کا ایک بھی امیدوار پوسٹ گریجویٹ ڈگری کے ساتھ نہیں مل سکا۔

پروفیسر جابر حسین نے ریاست بہار میں حقوق انسانی کمیٹی کی بھی تشکیل کی۔ پورے ملک میں اس کمیٹی کو کسی ریاست کی واحد کمیٹی ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اقلیتی فلاحی محکمہ کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، یہ بھی بہار میں سب سے پہلے قائم ہوا۔ پروفیسر جابر حسین ہی کی کوششوں سے اردو بہار قانون ساز کاؤنسل کی آئینی زبان بنی، کاؤنسل میں اردو شعبہ اور اردو کمپیوٹر سیکشن قائم ہوئے۔ کاؤنسل کی تمام نشستوں کی اطلاعات اور کارروائیوں کی رپورٹ اردو میں وقت سے آنے لگیں۔ پروفیسر جابر حسین کے ان کارناموں نے انہیں ان کے سراپا احتجاج کے باوجود دو اقلیتوں اور پسماندہ طبقوں کے رضاکار کی جگہ سپہ سالار بنا دیا۔

معارف کی ڈاک

مکتوب دہلی

مکرمی! سلام مسنون

جون ۱۹۹۷ء کے معارف میں جناب گوردیال سنگھ مجذوب نے کہف کے بارے میں جو تحقیق پیش کی ہے وہ ان کے وسیع مطالعہ کو ظاہر کرتی ہے۔ لیکن انہوں نے کہف (غار۔ کھوہ) کے لیے انگریزی لفظ COVE پر غور نہیں فرمایا، یہ بھی کہف کی بدلی ہوئی شکل ہے، اور تبدیلی بھی وہی وی (V) اور ف کے تلفظ کی بنیاد پر ہے۔ انہوں نے یہاں ف کی جگہ وی (V) کا تلفظ لے لیا ہے باقی سارے الفاظ وہی ہیں جو عربی میں ہیں، چھوٹی ہ کو اے (A) سے بدل دیا گیا ہے کیونکہ اہل یوروپ عام طور پر تلفظ ACCENT لہجہ میں ایسی تبدیلی کر لیتے ہیں، انگریزی میں بہت سے ایسے الفاظ ہیں جن کی اصل عربی ہے اور تلفظ کے فرق سے اس کی صورت بدل گئی ہے، کچھ ایسے انگریزی الفاظ ہیں جو عربی میں مستعمل ہیں لیکن اپنی اصل سے بیگانہ نہیں ہوئے ہیں، دراصل اندلس میں عربوں کے طویل اقتدار کے دوران یوروپ نے مسلمانوں سے بہت کچھ حاصل کیا۔ اس دور میں جسے یوروپ کا دور ظلمت کہا جاتا ہے، قرطبہ و غرناطہ کی دانشگاہیں علوم و فنون کی مشعل فروزاں تھیں۔ عربوں نے ترجمہ کے ذریعہ اغریقی (یونانی) فلسفہ و علوم کو زندہ کیا، جالینوس، سقراط، بقراط فیثاغورث وغیرہ فکری طور پر زندہ ہوئے طب، فلسفہ، سائنس اور ٹیکنالوجی میں عربوں نے جو ایجادات کیں انہوں نے اہل یوروپ کو مبہوت کر دیا تھا۔ روایت ہے کہ جب

عربوں نے آلۂ اصطرلاب ایجاد کیا تو ایک مسیحی دانشور اس سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اپنے بیٹے کا نام ہی اصطرلاب ASTRALOBE رکھا۔ اسی طرح ایک روایت ہے کہ ایک عرب سردار عمرو بن لحی علاج کی غرض سے شام گیا وہاں اس نے یونانی صنمیات کا مشہور بت اپالو (APOLLO) دیکھا، یہ عقیق کا بنا ہوا بڑا خوبصورت بت تھا، یونان میں اپولو موسیقی محبت اور شباب کا دیوتا مانا جاتا ہے۔ عمرو اپولو کا ایک بت اپنے ساتھ لایا اور اسے کعبہ میں رکھ دیا۔ پہلے یہ اپولو کہلایا اور پھر ہبل بن گیا۔

بہرکیف عرب اور یوروپ کے تہذیبی رشتے بہت گہرے ہیں۔ ذیل میں ایسے چند الفاظ کی فہرست پیش کی جا رہی ہے جو صوتی و معنوی اعتبار سے ایک جیسے ہیں۔

ارض	EARTH	(زمین)	قطن	COTTON	کپاس
قندیل	CANDLE	موم بتی	قط	CAT	بلی
عقیق	ANTIQUE	قدیم	اسطوری	STORY	حکایت
جمل	CAMEL	اونٹ	شربت	SYRUP	مشروب
بیل الفیل	ELEPHANT	ہاتھی	الکحل	ALCOHOL	
الاکسیر	ELIXIR	اکسیر	بیطار	VATERINAY	علاج مویشیاں
طریق	TRACK	راستہ	صفر	CYPHER	صفر
	(TREAD)	چلنا	اثیر	ETHERE	آسمانی
جرائم	CRIME				
قنطار	QUINTAL	سو کلو گرام	قانون	CANON	شرعی ضابطہ
قیراط	CARAT	سونے کا وزن	فرس	HORSE	گھوڑا
کیل	SCALE	پیمانہ	حشیشی	ASCASSIN	باطنیوں کا قاتل گروہ (قاتل)

الوداع	ADIEU	(فرانسیسی متبادل)	الحمدللہ	ALLEBNIA	حمد باری
واللہ	OLE	اظہار مسرت کے لیے اسپینی لفظ			

اسی طرح سنسکرت اور فارسی کی قربت کی بات ہے، ماہرین لسانیات کا کہنا ہے کہ یہ دونوں زبانیں حقیقی بہنیں ہیں۔ اس میں الفاظ کی مماثلت بہت عام ہے۔ یہاں صرف ایک لفظ نم کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ اس کے معنے سر جھکانا، تعظیم کرنا (نمستے) ہے، فارسی میں یہ لفظ نماز (عبادت) بن گیا ہے۔ نم دونوں میں مشترک ہے۔

یہ بڑا دلچسپ موضوع ہے اور ماہرین لسانیات نے اس پر کافی کام کیا ہے۔ عربی، عبرانی اور سریانی، سامی زبانوں کی قربت تو واضح بات ہے۔ سنسکرت کے اثرات بھی عرب علاقوں میں گہرے رہے ہیں۔ اسلام سے قبل عربوں کے آس پاس کے علاقے خصوصاً وسطی ایشیا میں بودھ مذہب کو عروج حاصل تھا۔ اس لیے بہت سے سنسکرت، پالی اور اس وقت رائج زبانوں کے الفاظ بودھ بھکشوؤں کے ذریعہ وہاں پہنچتے رہے اور اہل عرب جو کہ تجارت کے لیے ہندوستان، شام، سمرقند و بخارا وغیرہ کے سفر کرتے تھے اور خود بودھ مبلغین کی اپنے مذہب کی اشاعت میں دور دراز کے علاقوں میں سرگرمیاں اس لسانی قربت و ہم آہنگی کا خاص سبب تھیں۔

والسلام

نیازمند

اطہر نقوی

جامعہ نگر، نئی دہلی

۹۷/۷/۳۰

آثارِ علمیہ و تاریخیہ

قرن اول کی کتابیں

از مولانا عبداللہ عمادی

عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ دوسری صدی ہجری سے قبل مسلمانوں نے تصنیف و تالیف کا آغاز نہیں کیا تھا اور اسلامی تعلیمات کا وہ ایمان افروز مجموعہ جسے حدیث اور اخلاقیات کہتے ہیں تقریباً ایک صدی تک غیر مرتب رہا۔ ان کے خیال میں تصنیف کی ابتدا ابن جریج (وفات ۱۵۰ھ) سے ہوئی اور پھر امام مالک (وفات ۱۷۹ھ) نے "موطا" لکھ کر متعاقبین کے لیے تصنیف و تالیف کا راستہ کشادہ کر دیا۔ پس کتاب ابن جریج اور موطا دوسری صدی ہجری کی تالیفات ہیں۔

اس طرح رسول اللہ صلعم کی تعلیمات کا ایک صدی تک غیر منضبط رہنا ایک نکتہ سنج کی نگاہ میں ضرور کھٹکتا ہے اور اسی بنا پر یورپی اقوام نے اسلام پر صدہا اعتراضات کیے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک فاش تاریخی غلطی ہے اور افسوس کی بات ہے کہ امام ذہبی اور حافظ ابن حجر جیسے نامور اور باکمال محدثین بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

اگرچہ مسلمان ہمیشہ مذہبی تعلیمات کے لیے قرآن حکیم ہی کو حرف اول و آخر سمجھتے رہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ قانون تمدن کی پہلی دفعہ (تصنیف و تالیف) سے بے خبر رہے۔ بلاشبہ عرب میں کتابت کا رواج نہ تھا۔ نزول قرآن سے قبل بمشکل بارہ یا تیرہ اشخاص کو لکھنا آتا تھا اور اگر کوئی لکھائی کے ساتھ تیر اندازی و پیراکی بھی جانتا تو وہ

صاحبِ کمال سمجھا جاتا۔ تمام ملک عرب اسی جہالت میں مبتلا تھا لیکن آفتاب اسلام کے طلوع ہوتے ہی ان ہی عربوں نے "طلع الصباح وطفی المصباح"[1] کے فقرہ کو سچا ثابت کر دکھایا۔ مسلمانوں نے تمدن کی مختلف شاخوں میں ترقی کی۔ حدیث کی کتابیں اسی زمانہ میں تالیف ہوئیں۔ لیکن تالیف کے لیے جس تہذیب و ترتیب کی ضرورت پڑتی ہے اس کے آثار دوسری صدی ہجری میں قائم ہوئے۔ مولفین ان ہی مکمل و مرتب تالیفات کو دوسری صدی ہجری کی یادگار بتاتے ہیں۔ ورنہ یہ ایک حقیقت ہے کہ حضرت علیؓ کی کتاب القضایا اور حضرت ابن عباسؓ کی حدیث کی کتاب تیسویں ہجری سنہ ۳۰ھ تک تالیف ہو چکی تھیں۔

مگر یہ کتابیں مختصر و ناکافی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ابن شہاب زہری نے جب ایک مبسوط کتاب لکھی تو یہ بات مشہور ہوئی کہ حدیث کے سب سے پہلے مولف و مدون ابن شہاب زہری ہیں۔ جن کو حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے اس کام پر مامور کیا تھا۔[2] اسی طرح ابوبکر حزمی نے بھی حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کی ترغیب پاکر حدیث کی کتابیں تالیف کی تھیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کی وفات سنہ ۱۰۱ھ میں ہوئی، لہذا اس کام کے آغاز کو پہلی صدی ہجری سے ہی نسبت ہوتی ہے۔ مسلمان عموماً اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ حدیث کی کتابیں دوسری صدی میں ابتداً سعید بن ابی عروبہ، ربیع بن صبیح، ابن جریج اور مالک بن انس نے تالیف کیں۔ ان میں کی آخری تالیف (موطا) موجود ہے جسے اسلامی تمدن کی پہلی کتاب کہتے ہیں۔[3]

---

[1] یعنی صبح ہوتے ہی شمعیں بجھا دی جاتی ہیں، اسی طرح اسلام آتے ہی تمام جھوٹی روایات اور بے بنیاد قوانین پر پانی پھر گیا [2] زرقانی ص ۱۰ [3] زرقانی ص ۱۰، یہ اور اس سے قبل کا حاشیہ نہیں ملا۔ (معارف)

تاریخ شاہد ہے کہ ہجرت کے پچیس تیس سال بعد مسلمانوں نے کتابت کی طرف توجہ کی اور مختلف عنوانات پر کتابیں لکھنی شروع کیں[1]۔ زائدہ بن قدامہ نے جو حسن بن عطیہ کے ساتھ جنگ روم میں شہید ہوئے فن حدیث، تفسیر تجوید اور اخلاقیات پر کئی کتابیں لکھی تھیں۔ ابن الندیم نے ان کی کتاب السنن، کتاب القراءت، کتاب التفسیر کتاب الزہد اور کتاب المناقب کا تذکرہ کیا ہے۔

امیر معاویہ کے حکم سے عبید بن شریہ جرہمی نے اقوام عالم کی ایک تاریخ مرتب کی عوانہ نے سوانح حیات پر ایک کتاب لکھی اور امیر معاویہ کی سوانح بھی لکھی۔ کتاب الفہرست کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی کتاب ہیں۔

فن تفسیر کی ابتدا بھی اسی عہد میں ہوئی۔ حضرت علیؓ اکثر اوقات قرآن مجید کے مطالب بیان کرتے۔ حضرت ابوحمزہ ثمالی سنا کرتے۔ انہیں اسی طرح تفسیر قرآن لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ ان کی تیار کردہ تفسیر کئی جلدوں پر مشتمل تھی اور ایک جلد میں بسا اوقات سات سو یا اس سے زیادہ اوراق ہوتے[2]۔

ان کتابوں میں عنوان ہمیشہ مختلف النوع ہوتے۔ مثلاً مسئلہ خلافت کے متعلق ابن ہشیم کی کتاب الامامۃ" اور" کتاب الاستحقاق"۔ علم تاریخ میں اشنانی کی کتاب" فضائل علی و مقتل حسن بن علی" اور علم کلام میں" سلیم بن قیس ہلالی" نامی کتابوں میں یہ جدت بہ وضاحت نظر آتی ہے۔

اس قرن اول (ساتویں صدی عیسوی) میں نہ صرف حدیث، تفسیر، کلام اور سیرت میں تصنیف و تالیف کا آغاز ہوا بلکہ حسب ضرورت اکثر علوم و فنون مثلاً علم طب

[1] فتوح البلدان۔ بلاذری۔ ص ۷۹۔ [2] کتاب الفہرست۔ مطبوعہ لیپزنگ جرمنی۔ ص ۱۰۷۔

وکیمیا کی طرف بھی توجہ کی گئی اور ان پر متعدد کتابیں لکھی گئیں۔

غیر زبانوں کے عربی ترجمے اسی عہد کی پیداوار ہیں۔ مثلاً خالد بن یزید کے لیے کئی کتابیں یونانی سے عربی میں ترجمہ ہوئیں[1]۔ لیکن واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ خالد کے دادا حضرت معاویہؓ اس سلسلے میں اولیت کے مستحق ہیں جن کے حکم پر ملک شام کے ایک عیسائی طبیب" ابن اثال" نے طبی کتابیں یونانی سے عربی میں ترجمہ کیں۔ خالد بن یزید نے چند یونانیوں کو جو مصر میں پناہ گزیں تھے ملک شام میں طلب کیا اور ان سے فن کیمیا و طب کی یونانی اور قبطی کتابوں کا عربی ترجمہ کرایا۔ علامہ ابن ندیم نے کتاب الفہرست میں پہلی صدی ہجری کی کیمیائی تصانیف اور تراجم کی ایک طویل فہرست پیش کی ہے۔ مثلاً کتاب الحرارت کتاب الوصیت وغیرہ[2]۔

عموماً خالد بن یزید کا "خزانۃ الکتب" پہلا اسلامی کتابخانہ سمجھا جاتا ہے اور ہم بھی اس کتاب خانہ کی وسعت، حسن انتظام، کتابوں کی فراوانی اور خوبی و کمال کو دیکھ کر اس رائے کو تسلیم کرتے ہیں لیکن فی نفسہ اس سے قبل بھی کتابخانے کا وجود ثابت ہوتا ہے تاریخ بتاتی ہے کہ ابن ابی بعرہ کا کتابخانہ ہر لحاظ سے قابل قدر تھا جو ۶۲ھ کے بعد قائم ہوا تھا۔ محمد بن اسحاق صاحب مغازی متوفی ۱۵۰ھ نے بچشم خود اس کتابخانے کو دیکھا اور ان کا بیان ہے کہ ابن ابی بعرہ کو ان کے ایک دوست نے جو کوفہ کے سر برآوردہ تھے مرتے وقت یہ کتابخانہ ہبہ کیا تھا۔ واللہ اعلم۔

[1] کتاب الفہرست۔ مطبوعہ لیپزنگ جرمنی۔ ص ۱۰۷ [2] ایضاً: ص ۳۵۱ تا ۳۶۰

مکاتیب علامہ سید سلیمان ندوی

بنام

مفتی ظہور احمد دربھنگوی و مولوی وحید احمد صاحب

اعظم گڑھ

مجی تسلیم

میں اس وقت سفر کے لیے پا بہ رکاب ہوں، "بلبل" میرے خیال میں فارسی ہے، بلبل عرب میں نہیں ہوتا، نہ شعرائے عرب بلبل باندھتے ہیں، وہاں "عمامہ" باندھتے ہیں، اس وقت دلائل اور اسناد سے معاف کیجیے۔

والسلام

سید سلیمان

۹ر مارچ ۱۸ء

اعظم گڑھ

محب مکرم السلام علیکم

محبت نامہ مسرت افزا ہوا، آپ کی علالت اب کی طول پکڑ گئی، شاید ورم طحال کا کوئی اثر معلوم ہوتا ہے، دعائے صحت کرتا ہوں، عجل اللہ شفاءک۔

آپ نے اپنے جس عزیز کی نسبت لکھا ہے، افسوس ہے کہ ایک سال کے لیے اس کا وقت گزر گیا، ہر سال کے تمام پر عرضیاں آجاتی ہیں اور مدرسہ کھلتے فیصلہ ہو جاتا ہے، چونکہ عرضیاں کثرت سے آتی ہیں اس لیے بڑی دشواری پیش آتی ہے، صرف ۲۵ جگہیں ہیں سال میں دو تین جگہیں خالی ہوتی ہیں۔

نیا نصاب ابھی چھپا نہیں، قواعد وغیرہ البتہ ہیں، جو ہر وقت چھپے ملتے ہیں، نیس ۸ ماہوار ہے، قواعد نسخہ دفتر ندوہ سے منگوا لیجیے، آٹھ درجے تعلیم مولویت کے ہیں، دو تکمیل کے، چار ٹکٹ واپس مرسل ہیں۔

خواجہ عبدالواجد مدت کے بعد امسال دار المصنفین آئے تھے۔ کئی روز رہے۔ . .[1] ....

والسلام

سید سلیمان

۹ر جولائی ۲۳ء

اعظم گڑھ

محب محترم دام لطفہ

السلام علیکم۔ تاتار خان پر ایک مضمون فروری ۳۲ء کے معارف میں چھپ چکا ہے، کیا آپ نے نہیں دیکھا،

اس کا آبائی وطن خراسان تھا اور صغر سنی میں ایک خراسانی حملہ کے وقت ہندوستان میں چھوٹ گیا اور یہیں شاہ دہلی کے محل میں تعلیم و تربیت پائی۔

ولادت غالباً ۸۱۵ھ کے قریب یا بعد اور وفات ۸۸۰ھ اور ۸۸۵ھ کے بیچ میں۔

امید کہ مزاج بخیر ہوگا، زندہ ہوں اور طالب دعا ہوں۔

والسلام

سید سلیمان

۳۲ء

---

[1] آخری سطر کرم خوردہ ہے۔

برادرم مولوی وجیہ احمد صاحب دام لطفہ

السلام علیکم حسب الارشاد مولوی ظہور احمد صاحب کو جواب دیدیا کہ سال گزر گیا اور غیر مستطیع طلبہ کا انتخاب ہو چکا۔

آپ کی علالت کا حال سن کر افسوس ہوا، آخر یہ لنگ پائی کب تک رہے گی، عید اضحیٰ کے موقع پر "بیگم" مظفر پور جائیں گی، میں بھی ہم رکاب ہوں گا، اگر آپ عید منانے گھر نہ چلے جائیں تو "تقابل" ہوگا۔

والسلام

سید سلیمان

۹ جولائی ۲۳ء

دار المصنفین کا سلسلہ مکاتیب

مکاتیب شبلی: حصہ اول، علامہ شبلی کے ان خطوط کا مجموعہ جو انہوں نے عزیزوں اور دوستوں کے نام لکھے، جن میں ملکی، قومی، مذہبی خیالات و مسائل کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ قیمت ۴۰ روپے

مکاتیب شبلی: حصہ دوم، علامہ شبلی نعمانی کے ان خطوط کا مجموعہ جو انہوں نے اپنے تلامذہ کے نام لکھے اور جن میں زیادہ تر علمی اور اصلاحی خیالات کی ان کو تلقین کی۔ قیمت ۳۵ روپے

برید فرنگ: مولانا سید سلیمان ندوی کے ان خطوط کا مجموعہ جو انہوں نے یورپ سے اپنے عزیزوں کے نام لکھا اور جن میں یورپ اور دنیائے اسلام کے سیاسی و اجتماعی حالات و تبصرے اور اکابر اسلام کی ملاقاتوں کا حال بیان ہوا ہے۔ قیمت ۳۵ روپے

مشاہیر کے خطوط: اس میں سید سلیمان ندوی کے نام مولانا حالی، مہدی، افادی، سید اکبر حسین الہ آبادی، علامہ اقبال وغیرہ کے خطوط ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

قیمت ۴۵ روپے

مطبوعات جدیدہ

ایشیاٹک سوسائٹی کی خدمات فارسی (از ڈاکٹر خالدہ حسین)

متوسط تقطیع، بہترین کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۱۲، قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ: قاسمی دواخانہ ۸۰ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ ۷۰۰۰۷۳ اور مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی بجا طور پر ان چند قدیم اہم علمی اداروں میں ہے جنھوں نے مخطوطات و مطبوعات کے جمع و تحفظ کے علاوہ علوم و فنون کی تحقیق، فروغ اور ترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے، ۱۹۸۴ء میں اس نے اپنے قیام کے دو سو سال پورے کر لیے، لیکن اس قدر قدیم اور اہم ادارہ کی تاریخ اور اس کے خزانۂ نوادر سے خواص تک بھی کم ہی واقف ہیں، اس کتاب کی حوصلہ مند مصنفہ نے اس ضرورت کو محسوس کر کے اسے اپنے پی ایچ ڈی کا مقالے کا موضوع بنایا اور گو اس بحر زخار میں صرف فارسی زبان پر توجہ مرکوز کی، لیکن ساڑھے چار ہزار فارسی مخطوطات اور ادارہ کی وسیع فارسی خدمات کا مکمل جائزہ بھی آسان نہیں تھا، لیکن لائق مصنفہ اس دشوار گزار مرحلے سے بحسن و خوبی گزر گئیں، انہوں نے ابتدا میں بنگال میں فارسی زبان و ادب کے فروغ اور سوسائٹی کے بانی سر ولیم جونس کے متعلق معلومات افزا ابواب سپرد قلم کیے اور اس کے بعد مذہب، تاریخ، تذکرہ، سوانح، تصوف، ادب و شعر، قواعد لغت، علوم و فنون، قصص و حکایات اور ترجمہ کے زیر عنوان اہم اور نادر مخطوطات کا جس

سلیقہ سے تعارف کرایا وہ ان کے ذوق تحقیق و سلیقہ تصنیف کا عمدہ نمونہ ہے، ابن جریر طبری کی تفسیر کے فارسی ترجمہ کے مخطوطہ کا چند سطروں میں تعارف اس کی ایک مثال ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مخطوطہ برٹش میوزیم میں موجود نسخہ سے قدیم تر ہے، سوسائٹی کے ایک صدر کول بروک کی خدمات کے ضمن میں لکھا کہ "راجہ رام موہن رائے کے ستی پر رسالہ لکھنے کے بیس سال پہلے کول بروک نے ہندوؤں کی ابتدائی کتابوں سے یہ ثابت کیا تھا کہ ستی مذہب کی روایات کے برعکس ہے"۔ بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ اپنے موضوع پر اردو میں اولین تحقیقی کاوش ہے، البتہ بعض طویل فارسی اور انگریزی اقتباسات بغیر ترجمہ کے ہیں، ظاہری لحاظ سے بھی کتاب بڑی دلکش ہے، اعلیٰ درجہ کے کاغذ اور طباعت اور بامعنی سرورق نے اس کے حسن میں اور اضافہ کردیا ہے۔

مطالعہ مثنویات مصحفی از محترمہ ڈاکٹر سعیدہ دارثی، متوسط تقطیع عمدہ کاغذ و کتابت و طباعت، مجلد، صفحات ۲۳۶، قیمت ۱۰۰ روپے پتہ: مکتبہ جامعہ دہلی۔

متقدمین شعرائے اردو میں شیخ حافظ غلام ہمدانی مصحفی کی حیثیت مسلم الثبوت استاد کی ہے، میر و سودا و سوز بلکہ پیش رو اساتذہ کے کمالات و خصائص ان میں اس طرح یکجا ہوگئے تھے کہ بلاشبہ وہ اپنے ہم عصروں سے فائق و برتر ہوئے، ان کے شاگردوں کی کثرت بھی ان کے کمال کا بین ثبوت ہے، پختگی و بلندی و صفائی اور شیرینی و رنگینی ان کے کلام کا خاص جوہر ہے، اصلاً وہ غزل کے شاعر تھے، فارسی اور اردو کے متعدد کلیات و دواوین ان کی یادگار ہیں، صنف مثنوی میں بھی ان کی تقریباً بیس نظمیں ہیں جو ان کی غزلوں کی شہرت میں دب سی گئیں اور ان سے اعتنا کم کیا گیا، اس کتاب میں اس کمی کو بحسن و خوبی پورا کیا گیا ہے، مصحفی کے حالات اکثر مستند تذکروں کی مدد سے بیان

کرنے کے بعد ان کی مثنویوں کا تعارف اور پھر مصحفی کا بحیثیت مثنوی نگار مبصرانہ جائزہ لیا گیا ہے، ایک باب میں دوسرے اہم مثنوی نگار شعراء مثلاً میر، سودا، انشا، میر حسن، میر اثر اور جرات سے ان کا موازنہ کیا گیا ہے اور غیر جانبداری سے محاسن و نقائص کو واضح کیا گیا ہے، مصنفہ کا خیال ہے کہ مجموعی حیثیت سے مثنوی نگاری میں مصحفی دوسرے درجہ کی صف کے آدمی ہیں لیکن کہیں کہیں یہ بھی تحریر کیا ہے کہ "ان کی مثنویاں رعایت لفظی اور خیال بندی کے لحاظ سے دبستان لکھنؤ کا شاہکار ہیں"، مصحفی کی پرگوئی، مضمون آفرینی، طرز ادا اور پرتکلف اسلوب بیان کی داد دیتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ داستان کو آگے بڑھانے اور پھیلانے کا سلیقہ اور اجزائے داستان بر محل نمایاں کرنے کا شعور، میر کی دریائے عشق سے زیادہ مصحفی کی بحر المحبت میں ملتا ہے، اس کے باوجود مصحفی کو مطلق دوسرے درجہ کا مثنوی نگار قرار دیا جانا ممکن ہے تضاد پر محمول کیا جائے۔ کتاب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں مصحفی کی اکیس مثنویاں بھی تعلیق و تحشیہ کے ساتھ شامل کی گئی ہیں جو اس سے پہلے متفرق و منتشر تھیں۔

شمع فروزاں مرتبہ جناب عمر خالدی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت اور طباعت عمدہ، مجلد، صفحات ۱۸۶، قیمت ۵۰ روپے، پتہ: اسٹوڈنٹس بک ڈپو، چار مینار، حیدرآباد، اے۔ پی۔

حیدرآباد دکن کا خطہ زر و سیم و جواہر کی قدرتی دولت سے مالا مال ہونے کے علاوہ کاملان علم و فن کی ثروت سے معمور رہا، ان میں سے بعض گو ناموری اور شہرت سے دور ہیں لیکن ان کے سوانح، ان کی عظمت و جلالت کے خود داستان گو ہیں، اس کتاب میں مولوی جمیل الدین احمد، مولوی سید قطب الدین محمودی، مولانا سید

عبدالباقی شطاری اور ابوہاشم سید یوشع کا شمار ایسی ہی شخصیات میں ہوتا ہے، سید مبارز الدین رفعت اور ڈاکٹر ابو النصر محمد خالدی اہل علم میں محتاج تعارف نہیں، ان تمام فاضل ہستیوں کے ذکر سے مقصود یہی ہے کہ استفادہ کے لیے ان کے کارناموں کو بطور یادگار محفوظ کر لیا جائے۔

پہلا مضمون رائے جگن ناتھ پرشاد معروف بہ مولوی جمیل الدین پر ہے اور اس درجہ دلچسپ اور موثر ہے کہ بار بار پڑھنے سے بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی، اس کے فاضل مضمون نگار ابو النصر خالدی مرحوم پر خواجہ معین الدین غرمی کا مضمون بھی اسی درجہ دلچسپ ہے، ایک اضافی خوبی پروفیسر مبارز الدین رفعت مرحوم کے نام مجموعہ مکاتیب ہے، یہ کتاب واقعی اسم بامسمیٰ ہے جس سے نور و سرور حاصل ہو کر رہتا ہے۔

آئینہ در آئینہ از جناب اثر انصاری، متوسط تقطیع، کاغذ اور کتابت و طباعت عمدہ، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۵۲، قیمت ۳۰ روپے، پتہ: نکھار پبلی کیشنز، مئوناتھ بھنجن، یوپی۔

جناب اثر انصاری کہنہ مشق اور استاد شاعر ہیں، اس سے پہلے ان کی غزلوں کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں، زیر نظر مجموعہ نظموں پر مشتمل ہے، انہوں نے علامہ اقبال اور جوش ملیح آبادی سے متاثر ہو کر نظم گوئی کی جانب توجہ کی، ایک موثر نعت پاک سے اس مجموعہ کا آغاز کیا گیا ہے لیکن زیادہ تر نظمیں ملک کے نصف صدی کے سیاسی ماحول کی عکاس ہیں، ہندوستان کی آزادی، عصر جدید، افسانہ غارتگری، خلش نامعلوم، بازگشت اور انتظار وغیرہ سے نظم گوئی میں ان کی قادر الکلامی ظاہر ہوتی ہے، بعض نظمیں اہم علمی و ملی شخصیتوں کی مدح و رثا میں ہیں، جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کے متعلق پُراثر نظم کا آخری شعر ہے:

تو نہیں لیکن تحریر تو رخشندہ ہے
صفحۂ تاریخ میں تو زندہ و پائندہ ہے

ع - ص -